پہلا باب

سفید فلک رسا عمارت پر اُس نے سر اُٹھا کے نظر ڈالی۔ یہ شہر کا سب سے مشہور کالج تھا یہاں ہی اب وہ ایف۔ اے کے کلاس میں داخلہ لینے آیا تھا۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ کشادہ موری والی پتلون اور بند گلے کا کوٹ اس کے زیب تن تھا۔ وہ گاؤں کا ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ جس نے حال ہی میں میٹرک پاس کیا تھا۔ ماں بچپن ہی میں فوت ہوئی تھی اور والد صاحب کا خیال تھا کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ان کا بیٹا تحصیلدار بن جائے گا۔ ویسے ان کی بیس تیس کنال زمین تھی اور ان دونوں کی زندگی مزے سے گذر رہی تھی۔ لیکن اب کالج میں پڑھنے کے لئے ایک نئی زندگی تھی۔ یہاں گاؤں کی سیدھی سادی زندگی نہیں تھی۔ رنگین قہقہوں میں لپٹی ہوئی اس بستی میں قدم قدم پر فریب اور دھوکہ تھا۔

وہ کالج کے بہت بڑے میدان میں پہنچ گیا۔ جہاں داخلے کے فارم دئے جا رہے تھے۔ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک

قطار میں کھڑا کیا جاتا تھا۔ گاؤں کے اس چھوکرے کو یہ بات پسند نہیں آئی کیونکہ وہ گاؤں کے ماحول میں پل کر جوان ہوا تھا۔ وہ اس تہذیب یافتہ سماج سے بے بہرہ تھا۔ وہ مجبور ہو کر قطار میں کھڑا ہوا۔ اس کے آگے ایک لڑکی تھی۔

شہر کی لڑکی...... وہ گاؤں کا لڑکا۔

تہذیب یافتہ سماج کی لڑکی۔ اور وہ گاؤں کا الھڑ جوان۔

شہر کی اس لڑکی کے بال تراشے ہوئے تھے۔ کولگیٹ تیل سے اس کے سنہری بال دھوپ میں چمک رہے تھے۔ چست فراق میں اس کے جسم کے عضو عضو پھوٹ رہے تھے۔ ایک یہ گاؤں کا الھڑ جوان تھا۔ جس کی پوشاک اس قدر ڈھیلی تھی کہ وہ پتلون اور کوٹ میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔

لیکن شہر کی اس تہذیب میں عیاری چھپی ہوئی تھی۔ الھڑ ہوا شہر کے اس آدمی میں معصومیت موجود تھی۔ اس کا دل محبت بھرا تھا۔ وہ قدرت کے نظاروں کے بیچ پل کر جوان ہوا تھا۔ اس کے خون میں تصنع کی ذراسی بھی ملاوٹ نہیں تھی۔ وہ سادگی کا پرستار تھا۔ شرافت کا مجسمہ تھا۔ لڑکی کا چہرہ ضرور دلکش تھا۔ لیکن بناؤ سنگار کا مرہون منت تھا۔ گاؤں کے لڑکے کو اپنے پیچھے پا کر۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کو کوفت ہوئی۔ پرانے فرسودہ لباس میں جوان کو دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں اس کی ہنسی اڑائی۔ لیکن گاؤں کے نوجوان کو لڑکی کی گول گول اور بڑی آنکھیں

سے متاثر کیا۔ وہ ان آنکھوں میں گاؤں کی معصومیت پا رہا تھا۔ لیکن سنگتراش نے ان آنکھوں کو اس طرح ڈھلا تھا کہ یہ بہت بڑا گناہ کر کے بھی معصوم ہی لگ جائیں۔ ایسی آنکھیں خون اور محبت کا کھیل، کھیل کر بھی معصوم لگتی ہیں۔ لڑکی نے نوجوان سے کہا۔

"مسٹر"

لڑکی پہلی بار اس سے اس طرح مخاطب ہو رہی تھی۔ وہ گھبرا گیا لیکن اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا۔

"جی"

"میں باہر تک جا رہی ہوں۔ ذرا میری جگہ کا خیال رکھیے۔"

"جی ضرور"

لڑکی چلی گئی۔ لیکن ہمارا اصغر بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر محسوس کر رہا تھا۔ ایک شہری بابو نے اصغر سے کہا۔

"مسٹر گاؤں والے آگے چلیے۔"

"جناب یہاں پر ایک محترمہ کی جگہ ہے۔ وہ کسی کام سے باہر چلی گئی۔ آرہی ہوگی۔"

"اے میرے گاؤں والے آگے چل۔"

اصغر معصوم تھا لیکن اس کی غیرت بے حس نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے یہ بے عزتی برداشت کی۔ لیکن اس نے کہا۔

"جناب میں آگے نہیں جا سکتا ہوں۔"

شہری بابو کی مصنوعی غیرت کو ٹھیس لگی ۔ اُس نے تیز آواز میں کہا۔

"کمبخت تم لڑکی کے چاچا ہو"

انسان پھر بھی انسان ہے۔ معصوم کتنا بھی ہو۔ لیکن برداشت کی بھی حد ہوتی ہے ۔ اصغر نے کہا۔

"جناب زبان کو لگام دیجیئے"

"ارے گاؤں کے چھوکرے" شہری بابو نے غصیلی آواز میں کہا۔ "تم لڑکی کے لئے لال پیلے کیوں ہو رہے ہو۔ جیسے تم اس کے باپ ہو"

"شہری بابو دماغ کو درست کیجئے" اصغر نے گمبیر آواز میں کہا۔ "ورنہ مجھے درست کرنا پڑے گا"

اس تو تو میں میں کے درمیان دوسرے لڑکے بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ جب دوسرے لڑکے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ تب شہری بابو کے لئے عزت کی بات بن گئی ۔ لیکن اصغر کے صحت مند جسم کو وہ تک رہا تھا۔ جرأت اور ہمت اصغر کی جسامت دیکھ کر پسپا ہو رہی تھی۔ لیکن وہ ایک گاؤں کے چھوکرے کے سامنے ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔

شہری بابو نے اس کے کوٹ کا کالر پکڑا اور پھر اس کو کھینچتے ہوئے اُس نے کہا۔

"بے زبان کیڑے تیری یہ جرأت کہ تو میرے ساتھ زبان درازی کرے"۔

اُس نے اصغر کے گال پر زور دار چانٹا مارا۔ اصغر اپنے آپ کو چکراتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ وہ ہرگز اس حادثے کیلئے تیار نہ تھا۔
لیکن وہ جلد سنبھلا، اپنے آپ میں قوت سمیٹ لی۔ اصغر نے بھری ہوئی سی آواز میں کہا۔
"تو نے مجھے مارا۔"
پھرتی کے ساتھ اس کے ہاتھ چلنے لگے اور شہری بابو زمین پر گرنے لگا۔
لیکن شہری بابو کے دوست کیسے یہ بے عزتی برداشت کرتے کہ گاؤں کے ایک معمولی چھوکرے کے ہاتھ سے اُن کے دوست کی مار پٹائی ہو۔ اس کے چار دوستوں نے اصغر پر ایک ساتھ یلغار کیا۔
اصغر نے پھرتی کے ساتھ اس یلغار کا مقابلہ کیا۔ پھر بھی وہ اکیلا تھا۔ کب تک پانچ آدمیوں کے ساتھ لڑتا رہتا۔ آخر اس کی طاقت نے دم توڑ دیا۔ اس کے ماتھے پر زخم آیا۔ خون بہنے لگا۔ شہر کے پانچ بہادر ایک معصوم گاؤں کے چھوکرے کو ڈھیر کر کے فضا میں قہقہے بلند کرتے لگے۔ اپنی فتح کے گیت گانے لگے۔
سب لڑکے آہستہ آہستہ فارم لے کے روانہ ہو رہے تھے لیکن اس معصوم لڑکے کو کوئی نہیں پوچھ رہا تھا۔ جس پر اب تک غشی طاری تھی۔ وہ کلرک کے پاس گیا۔ اصغر نے کہا۔ "فارم"
فارم دیتے ہوئے کلرک نے کہا۔

"مسٹر تمہارے ہاتھ سے خون بہہ رہا ہے"

"جی ہاں"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو خون ہی بہا شہر چھوڑ آیا ہوں"۔

جی ہاں ابھی تو اس کا خون ہی بہا تھا۔ شہر کے ان عظیم تہذیب یافتہ لوگوں نے اس کا استقبال اُس کے خون کی ہولی سے کیا۔ فارم پر اُس کے ہاتھ سے خون کا قطرہ گر گیا۔

لڑکی واپس آئی۔ اُس نے اصغر سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے آپ کو میرے لئے زحمت اُٹھانی پڑی"۔

"ارے آپ کے ہاتھ سے خون بہہ رہا ہے"۔ لڑکی نے پھر کہا

"ہاں"۔

"لیجئے رومال"۔

اُس نے رومال ہاتھ میں لیا۔ لڑکی زادِ راہ لینے گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ کو رومال سے پونچھ لیا۔ محبت کے رومال پر خون کی چھینٹیں بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ اصغر خون اور محبت کی اس داستان کی ابتدا کو عجیب نگاہوں سے تک رہا تھا۔ لیکن لڑکی اس کی نظروں سے دور جا چکی تھی۔

اس کے ماتھے پر ایک اچھا خاصا زخم تھا۔ تب اس کو اپنا گاؤں یاد آیا۔ وہاں کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے نیچے اس کا بچپن پروان چڑھا تھا۔ اس کو اپنے گاؤں کی جھونپڑی یاد آئی جہاں اس کی زندگی کے اٹھارہ سال سکھ اور سکون کے ساتھ گذرے تھے۔ وہاں کبھی بھی اس کی زندگی میں انتشار پیدا نہ ہوا تھا۔

جب بھی کھیل کود سے اس کا پاؤں یا ہاتھ زخمی ہوتا تھا۔ وہ نزدیک کے گاؤں کے چھوٹے کلیسے میں جاتا تھا۔ اس کو فادر روسن یاد آگیا۔ جو اس کو گود میں اٹھا کر کہتا۔

"بیٹا۔ کیا کیا تم نے؟"

پھر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا تھا اور اس کے زخم پر دوائی لگا کے اس کے ہاتھ میں مٹھائی سویٹ دیتا تھا۔

اس کے اس میٹھے خواب کو شہر کے کمپونڈر نے منتشر کیا۔ اس نے کہا۔

"پٹی باندھ لی۔"

"باندھ لی۔"

"دو روپیہ نکال لو۔"

"دو روپیہ"۔ اصغر نے احتجاج کیا۔ کیونکہ اب بھی وہ لے بھائی کے خیالات میں بھٹک رہا تھا۔ لیکن یہ فادر ولسن نہیں تھا۔ جو ہاتھ میں مٹھائی دے گا۔ یہ شہر کا کمپونڈر ہے۔ جس کا ایک آنے کے بدلے بس آنے لینا اصول ہے۔ کمپونڈر نے کہا۔

"دو روپے مانگ رہا ہوں۔ کوئی جان نہیں مانگ رہا ہوں جو اس قدر گھبرا اُٹھے۔"

"ہاں دو روپیہ مانگ رہے ہو۔ جان نہیں مانگ رہے ہو۔"

کمپونڈر کے ہاتھ میں دو روپے دیکر وہ اپنے نئے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

شہر کے کسی اونچے مکان میں وہ کمرہ کرایہ پر نہیں لے سکتا تھا۔ جہاں سو دو سو روپے میں ایک فلیٹ کرایہ پر جاتا تھا۔ ہاں ایک پرانی گلی میں اور ایک خستہ حال مکان میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا تھا۔ اس کمرے کا کرایہ دس روپیہ تھا۔ لیکن اب تک وہ دس روپیہ ادا نہ کر سکا تھا اور مالک مکان نے دھمکی دی کہ اگر وہ آج شام تک کرایہ ادا نہ کر سکا تو اس کا بستر سڑک پر ہوگا۔

یوں تو اس کو یہ کمرہ بڑی مشکل سے ملا تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ بڑے

سستے دام پر یہ کمرہ حاصل ہوا۔ جہاں وہ ۱۰ اونچی بہت اونچی عمارتوں کا تصور کرتا تھا۔ وہاں اس کو اس کمرے کے لئے دس روپے معمولی بات لگتی تھی۔ اور وہ اس کمرے کو کھونے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔

خدا نے اس کی سن لی اور صبح ہی صبح اس کو پچاس روپے کا منی آرڈر ملا۔ پچاس روپے میں دو روپے دوائی فروش نے ہڑپ کر لئے۔ بیس روپے کا ایک سٹوو خرید لیا اور دس روپے کا کھانے کا سامان خرید لیا۔ اب اس کے پاس صرف اٹھارہ روپے تھے۔

اس کے مالک مکان مولانا بخش کا ذریعہ آمدنی صرف یہی ایک خستہ مکان تھا۔ مولانا بخش خود سامنے والے مکان میں رہتا تھا۔ اور ایک مکان کرایہ پر لگا کے رکھا تھا۔ اب مولانا بخش بوڑھا ہو گیا تھا اور اس کا شغل صرف کرایہ کے پیسے جمع کرنا تھا۔ گول گول اور چھوٹے سائز کا ڈنڈا اس کے ہاتھ میں ہر وقت رہتا تھا۔

مولانا بخش نے جب اصغر کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ تو اس نے کہا۔

"حضور آ گئے۔"

"محترم السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام" مولانا بخش نے جھنجھلاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بچے کرایہ دو اور پھر مکان میں داخل ہونا۔"

"حضور یہ لیجیے۔"

بس کا نوٹ دیکھ کے مولانا بخش نے اپنی لمبی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا
اور کہا۔
"واہ بیٹے۔ کس کی جیب مار کی؟"
"حضور یہ تو سیدھا گاؤں سے آیا ہے۔"
"بیٹے معصوم ہی لگتے ہو۔" مولانا بخش نے کہا۔
"خیر تم نے وقت پر کرایہ دیا۔ اس لئے ابھی ایک چائے کا پیالہ
بھجواتا ہوں۔"
"شکریہ جناب" اصغر نے کہا۔ "آپ کے خلوص کا۔"
"ماتھے پر زخم آیا ہے۔"
"گہرا نہیں ہے۔"
مولانا بخش نے کسی خیال میں سر ہلایا۔ اصغر اپنے چھوٹے سے کمرے
میں داخل ہوا۔ جس کمرے کی صرف ایک کھڑکی تھی۔ اس کی لمبائی دس
فٹ اور چوڑائی صرف آٹھ فٹ تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ کسی
نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اصغر نے کہا۔
"آو۔ کون ہے؟"
"جی چائے کی پیالی۔"
سریلی آواز کے ساتھ ایک لڑکی داخل ہوئی۔ گھریلو قسم کی یہ لڑکی
اٹھارویں سال میں جا رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور لمبے لمبے
بال تھے۔ اصغر نے اس کو دیکھا۔ لیکن وہ لڑکی اصغر کو متاثر نہ کر سکی

کیونکہ اُس کے پاس وہ حسن نہیں تھا۔ جو ایک ساتھ کسی مرد کو متاثر کر سکے۔ اصغر نے چائے کا پیالہ لیتے ہوئے کہا۔

"آپ شاید مولا بخش کی ......"

"بیوی"۔

لڑکی نے اس کا سوال پورا کیا جو اب لڑکی نہ رہی۔ اب وہ ایک گھریلو عورت بن گئی۔ اور اصغر اب تک کشمکش و برزخ کے عالم میں گرفتار تھا چائے گرم گرم گھونٹ اس کو زہر جیسے لگتے تھے۔ لیکن حقیقت حقیقت تھی۔

عورت خالی پیالہ لے کے چلی گئی۔ لیکن اصغر اب خوابوں کی دنیا میں بھٹک رہا تھا۔ جہاں وہ ایسے سماج کی تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ جس میں ایسی ناانصافیاں نہ ہوں۔

تب اس کے خواب کو کوئی منتشر کرتا ہے۔ وہ گاؤں کے تحصیلدار کا لڑکا تھا۔ دونوں گاؤں کے دوست تھے۔

لیکن وہ تحصیلدار کا بیٹا تھا اور اصغر ایک معمولی کسان کا بیٹا تھا۔ تحصیلدار کے بیٹے نے کہا۔

اصغر یہ اچھی جگہ نہیں ہے "

"لیکن میرے پاس اچھے پیسے بھی نہیں ہیں"

"آؤ میرے ساتھ"

"کہاں"

"نمائش دیکھنے جائیں گے"

"لیکن۔ نمائش تو نمائش ہی ہے"۔

"ارے چلو جلدی"۔

دونوں دوست نمائش گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ نمائش گاہ کی رنگین بجلیوں نے اندھیری رات کو پُر شباب بنایا تھا اور نمائش گاہ اس اندھیرے میں ایک چمکتی ہوئی دلہن لگتی تھی۔

نمائش کی دوکانوں کو دیکھ کے وہ نمائش کے چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ وہاں چائے نوش کر کے اصغر ایک لبساطی کی دوکان میں داخل ہوا۔ اس کو ایک خوبصورت قلم نے متاثر کیا۔ اس کو ایک قلم کی ضرورت تھی۔ لیکن چھ روپے کی رقم بہت بڑی رقم تھی۔ اصغر نے سوچا کہ اب ایک سال کے لئے قلم کا مسئلہ ختم ہوا۔ دوسری دوکان میں وہی لڑکی کھڑی تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے سر پر چوٹ کھائی تھی۔ اس کے ساتھ دو نوجوان تھے۔ وہ دو نوجوان اچھے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ان کے کپڑوں کی چمک میں اصغر اپنا وجود کھوتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ ایک نوجوان نے کہا۔

"چھوٹی رانی"۔

وہ رانی تھی لیکن اصغر راجہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ معزز شہری چل رہے تھے۔ لیکن وہ ایک غریب کسان تھا۔ اس کے ساتھ محبت کا تصور اصغر کو مضحکہ خیز لگا۔

اصغر کالج جانے کے لئے تیار ہوا۔ اب وہ سرسوں کے تیل اور اخروٹ کے سے بنایا ہوا مرکب اپنے بالوں کو لگا رہا تھا۔ اس کے والد نے کہا تھا۔ "بیٹا اس تیل سے عمر بھر آدمی کے بال سفید نہیں ہوتے۔" بالوں کو کنگھی کر کے وہ کتابوں کو سنبھالنے لگا۔ مولا بخش کی بیوی نصرت داخل ہوئی۔ اصغر نے اس کو دیکھ کر کہا۔

"آپ"

"جی میں اس لئے آئی ہوں"۔ اس نے ہچکچاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "آج آپ کالج جانے والے ہیں نا۔ اس لئے شگون کے لئے مٹھائی لائی ہوں۔ لیجئے"۔ مٹھائی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اصغر نے سوچا کہ یہ عورت بہت نیک ہے۔ میرا اتنا خیال رکھتی ہے۔

آج وہ پہلی بار کالج جا رہا تھا۔ پچاس روپے پتا سے اب بھی اس کے پاس دو روپے تھے۔ چلو رکشا میں سوار ہوتے ہیں۔ رکشا میں سوار ہو کے وہ اپنے آپ کو عالم شہنشاہ محسوس کرنے لگا۔ شہر

کی ان بڑی بڑی سڑکوں پر اس کا رکشا ایسے لگتا تھا۔ جیسے پرانے زمانے کے شہنشاہ کی سواری جا رہی ہو۔

لیکن جب اس کو یہ محسوس ہوا کہ اس رکشا کو کھینچنے والا ایک انسان تھا۔ انسان اور حیوان میں کیا فرق رہا۔ تب اس کو کوفت ہوئی اور وہ اس وقت اپنے آپ کو پریشانی کے عالم میں محسوس کرنے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ کل یہ رکشا والا تپ دق کا مریض ہو جائے گا۔ تپ دق کا نام آتے ہی اس کا دل کانپنے لگا۔ اس نے رکشا والے کو روک دیا۔ تب وہ پیدل کالج جانے لگا۔ وہ ایسی شاہی سواری میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ جس کی بنیاد انسانوں کی لاشوں پر رکھی گئی ہو۔

وہ کالج کی شاندار عمارت میں داخل ہوا۔ ہوا میں رنگ برنگے آنچل لہرا رہے تھے۔ شوخ قہقہوں نے فضا کے خاموش سماں میں زندگی بکھیر دی تھی۔

اصغر کو معلوم ہوا کہ وہ اس رنگین ماحول میں ایک کارٹون جیسا لگتا تھا۔ وہ ان فرسودہ کپڑوں کو اتار دینا چاہتا تھا۔ وہ اس میں رہ گئے دوسروں کے لئے ہنسی کا باعث نہیں بننا چاہتا تھا۔ کل جس لڑکے سے اس کی لڑائی ہوئی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہیلو اولڈ ماڈل" اور دوسرے لڑکے ہنس پڑے۔

اصغر خاموش رہا۔ لیکن دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ اب اپنے گاؤں کے لباس کو چھوڑ دے گا۔ لیکن کلاس میں جب اس نے دیکھا کہ لڑکیاں

اندر لڑکے لڑکیاں مل جل کے بیٹھے تھے۔ تب گاؤں کی ذہنیت نے پھر جوش مارا۔ اُس کو یہ پسند نہیں آیا کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ بیٹھیں۔ وہ لباس بدل سکتا ہے۔ لیکن اپنے دل و دماغ کو نہیں بدل سکا۔

ہسٹری کے پروفیسر نے ہندوستانی جنگ آزادی کے بارے میں حالات اور واقعات سے آگاہ کرایا۔ گھنٹہ ختم ہونے کے بعد وہ کلاس سے باہر آیا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد اس کی نظر اس لڑکی پر پڑی جس کی وجہ سے آج بھی اُس کے ماتھے پر زخم نمایاں تھا۔

وہ بچپن سے تنہائی پسند کرتا تھا۔ دراصل سکون اور خاموشی کا متلاشی تھا۔ ہنگامے سے اس کو قطعی دلچسپی نہیں تھی۔

وہ کالج کے پُرانے درخت کے نیچے بیٹھ کر ہسٹری کے اس سبق کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہر وقت آزادی کے لئے انسان خون بہاتا ہے۔ خون کا لفظ ہر بار اس کے دماغ میں اٹک جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ انسان کتنا سستا بن جاتا ہے۔ وہ اپنے نئے قلم سے جنگِ آزادی کے حالات کو قلمبند کر رہا تھا۔ کتنا خوبصورت تھا اس کا قلم۔

اس کی سفید کاپی پر ایک سایہ پڑ گیا۔ اس نے سر اُٹھا کے دیکھا۔ سامنے اُس لڑکی کو پایا۔ لڑکی نے کہا۔

"میرا نام صنوبر ہے۔ کل میں جلدی میں تھی۔ اس لئے آپ کا شکریہ ادا نہ کر سکی۔ خیر اب تو کرتی ہوں۔" پھر قلم پر نظر ڈالتے ہوئے۔

"آپ کا یہ قلم تو بہت خوبصورت ہے۔ کب خرید لیا؟"

"جی کل خریدا ہے!"

صنوبر نے قلم کو ہاتھ میں لیا۔ پھر اصغر سے کہا۔

"مجھے یہ قلم بہت پسند آیا ہے تو ایک معمولی قلم۔ اچھا میں اس کو رکھتی ہوں"۔

اصغر کچھ کہنے ہی والا تھا۔ لیکن کیا وہ کہتا کہ یہ قلم اس نے کل چھ روپے میں خریدا تھا۔ لیکن وہ کیسے۔ کہ تحصیلدار کا بیٹا بھی آیا۔

صنوبر نے کہا۔

"ہیلو! تحصیلدار صاحب"

"رانی صاحبہ میں ابھی تحصیلدار کا بیٹا ہوں تحصیلدار نہیں ہوں"۔

"میں بھی ابھی رانی نہیں ہوں"۔ صنوبر نے کہا۔

"لیکن مجھے یقین ہے کہ میں ایک دن رانی بن جاؤں گی۔ بہت بڑی ریاست کی!"

تحصیلدار کے بیٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جس کو اگر یقین ہو تو کوئی مبالغہ نہیں۔ لیکن ایسی ریاست ہوا میں اڑ جائے گی۔ کیونکہ اب یہ راجاؤں اور رانیوں کا وقت نہیں رہا"۔

"غلط ہے"۔ صنوبر نے کہا۔ "وہ بڑے بڑے لمبے چوڑے تعمیرات جو کھڑے کئے گئے۔ کیا وہ کسی ریاست سے کم ہیں۔ امیر آدمی اب بھی

راجہ ہے"

یہ حقیقت ہے۔ فریب کی آواز امیرانہ نظام میں ہر وقت دبی رہی ہے۔ امیرانہ نظام ہو یا راجہ ہو۔ لیکن فریب کے رہن سہن میں کبھی فرق نہ آیا۔ صنوبر نے تحصیلدار کے بیٹے سے کہا۔

"آپ کی جیب میں یہ کونسی بھاری چیز ہے"۔ تحصیلدار کے بیٹے نے کہا۔

"رانی صاحبہ یہ ایک معمولی کتاب ہے"۔

"ذرا ہم بھی دیکھ لیں"۔

"دیکھ لیجئے"۔

اس نے جیب سے کتاب نکال کر رانی کے ہاتھ میں سونپ دی۔ رانی نے کتاب کے چند اوراق پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ میں رکھتی ہوں۔ آپ نئی کتاب خرید لیجئے۔ اچھا اب گھنٹہ بجنے کو ہے"۔ یہ کہتے ہی وہ چلی گئی۔ تحصیلدار کے بیٹے نے اصغر سے کہا۔

"رانی ہر ایک کو لوٹنے میں ماہر ہے۔ لیکن کبھی تو کوئی اس کو بھی لوٹے گا"۔

"نہیں ایسا نہیں ہوگا"۔ اصغر نے اعتراض کیا۔ لیکن تحصیلدار کے بیٹے نے مسکرا دیا۔

"میرے پیارے یہ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جو دوسروں کی جیبیں کاٹتی ہیں۔ اس کے لئے تمہارے دل میں درد کیوں ہوا"۔

"درد"۔

یہ درد کیوں؟ وہ اپنے دل سے پوچھنے لگا۔ یہ درد محبت کا نام ہے۔ لیکن اس محبت میں کہاں ملاپ نظر آرہا ہے۔ وہ ریاست کی مالکن بننا چاہتی ہے اور وہ بائیں کنال زمین کا مالک ہے اور بائیں کنال اور ریاست میں بہت بڑا فرق نظر آرہا ہے۔ وہ کہاں حقیقت کو دیکھتا ہے۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ جہاں محبت کا میٹھا نام سننے میں آتا ہے۔

صنوبر کا ڈوپٹہ ہوا میں لہراتا تھا۔ آوارہ زلفیں اس کو پریشاں کر رہی تھیں۔ ہوا میں مستی تھی لیکن وہ شباب کی مستی میں جھوم رہی تھی۔ ٹمبس کی ماں نے اس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم آج بہت خوش نظر آرہی ہے بیٹا"

"جی ہاں ایک بھاری ہاتھ مارا ہے۔"

"یہ بیٹی ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں نے تو صرف ایک چانٹا اپنی سہیلی کو مارا۔"

"سہیلی ہے وہ۔"

"ہاں ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" صنوبر نے کہا۔

"لیکن میں تمہاری بیٹی ہوں نا۔"

"بیٹی!"

ماضی کے چند اوراق اس کے سامنے بکھرنے لگے اور حالات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آنے لگے۔

جب وہ دوشیزہ بنی جوان اور خوبصورت تھی۔ ایک طوائف کے گھر میں جنم لیا تھا۔ اس کے گھنگروں کی آواز محفل کی جان تھی۔ اس کے ہزار ہا پروانے تھے۔ لیکن وہ سب اس کے سمٹتے اور بڑھتے ہوئے پیٹ کے فدائی تھے۔ وہ اس کے حسن کے پرستار تھے۔ اس کے جسم کا دام لگاتے تھے۔ وہ ہر ایک بستر کی زینت بنتی رہی اور ہر ایک اس کے جسم سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ لیکن اس کو اس ہنگامے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہنگامے سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ محفل کی زینت نہیں بننا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی ماں نے تمام جوانی اس کے لئے داؤ پر لگا دی اور اب وہ آسانی کے ساتھ اس کو کھونے کے لئے تیار نہیں تھی۔ لیکن اس کی بیٹی اس ماحول میں ہمیشہ پریشان رہتی تھی۔ وہ اس ماحول سے چھٹکارا چاہتی تھی۔

نواب تیمور جنگ ایک دن اس طوائف کے در سے گذرے۔ اس کے حسن سے زیادہ اس طوائف کے انداز بیان سے متاثر ہوئے۔ کس ناز و ادا سے اس کے سامنے شراب کا پیالہ رکھا۔ نواب کا دل زخمی ہو کے رہ گیا۔ وہ بھیخ پڑا۔

"بولو میری جان کیا چاہیئے۔ پیاری تیری ان اداؤں پر ساری دنیا قربان کر دوں گا۔"

نواب صاحب زندگی میں پہلی بار عورت کے سامنے صدم ہو گئے۔

طوائف نے کہا۔
"یقین نہیں ہے مجھے۔"
"پیاری آزما کے دیکھو۔"
"میں جو بات کہنے والی ہوں۔" اس نے ایک ادا سے کہا۔ "وہ بڑی بات اور چھوٹے منہ والی بات ہے۔ میں آپ کی ہوں۔ صرف آپ کی ہونا چاہتی ہوں۔"
نواب چونک پڑے۔ اس نے کہا۔
"لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟"
"میں آپ کی ہونا چاہتی ہوں۔ کسی بھی طریقے سے میرے جسم کے عضو عضو پر آپ کا حق ہو گا۔ یہ مٹے بھری جوانی آپ کی ہو گی۔ میری ہر ادا آپ کے لئے وقف ہو گی۔ لیکن مجھے اس زندگی سے دور لے جائیے۔ میں اس ہنگامے سے دور بھاگ جانا چاہتی ہوں۔"
"لیکن" نواب صاحب کسی سوچ میں پڑ گیا۔
"اچھا! سوچتا ہوں۔"
لیکن اس کی ماں دام چاہتی تھی۔ اس کی ماں نے نواب سے صاف الفاظ میں کہا۔
"نواب صاحب مال آپ کے سامنے ہے ہزاروں میں ایک ہے۔ مناسب دام لگا دیجئے۔"

پھر دام لگایا گیا۔ سودا نپٹنے میں پورا ایک گھنٹہ ضائع ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ عورت کا سودا نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ کسی گائے بیل یا بھینس کا۔

لیکن طوائف کو آخر کار ہنگامہ خیز محفلوں سے نجات ملی۔ اب نواب کی داشتہ بن کر زندگی کے دن کاٹ لیتی تھی۔ اس کی بیٹی نے جنم لیا۔ وہ اپنی بیٹی کو اس ناسور زدہ سماج کے حصے سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ شرم و حجاب کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی رگوں میں شرافت کا خون بھر دینا چاہتی تھی۔ وہ زندگی کی اونچ نیچ سے اس کو واقف کرنا چاہتی تھی۔ وہ صنوبر کو سب کچھ دینا چاہتی تھی کہ صنوبر اپنے پاؤں پہ کھڑی ہو جائے۔ اس لئے تعلیم کے زیور سے اس کو واقف کرا رہی تھی۔

نواب تیمور جنگ مر گیا۔ اس کے ہاں جو آمدنی آتی تھی۔ وہ اس کی موت کے ساتھ بند ہو گئی۔ اب وہ جس مکان میں رہتی تھی، اس پر نواب کے اپنے بیٹے کسی دن دعویٰ جتلائیں گے۔

"خیر اس دن دیکھا جائے گا"۔

اس نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ اس کی بیٹی نے کہا۔

"کیوں، ماں کہاں کھو گئیں"۔

"میں پیچھے کی بسری باتوں کو یاد کر رہی تھی۔ بیٹی یہ میری عمر کھینے

کے لائق نہیں"

"ہاں میں تمہاری بیٹی ہوں"

اس کی ماں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں میری بیٹی"

نہ جانے اُس کو یہ کیوں بُرا لگتا تھا کہ اس کی بیٹی اس کی اولاد کہلائے۔

لیکن صنوبر کو اپنے اوپر اتنا یقین تھا۔ جتنا اس عالم پر اور اس کائنات پر اس خوداعتمادی میں اس قدر ڈوب گئی کہ وہ دوسروں کو انگلیوں پر نچا سکتی تھی اور اپنا دامن بھی بچا سکتی تھی۔

وہ دوسروں کو بیوقوف بنا سکتی ہے۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی بیوقوف نہیں بن سکتی ہے۔

اس کی ماں اس کو ہر وقت یاد دلاتی تھی کہ چالاک مت بنو خود کو کانٹوں میں مت گھسیٹ لو۔ لیکن وہ کہتی تھی کہ کانٹوں میں رہ کے بھی میں اپنا دامن بچا سکتی ہوں۔ صنوبر محبت سے زیادہ دولت کو اپنانا چاہتی تھی۔ وہ مادی شئے پر بھروسہ رکھتی تھی۔ وہ محبت کو بے معنی اور فضول سمجھتی تھی۔ وہ کارل مارکس کے فلسفے کی حامی تھی۔ وہ شادی کے رشتے پر بھی یقین نہیں رکھتی تھی۔ پھر بھی وہ شادی کے رشتے پر عمل کرنا چاہتی تھی۔

مارکس کے فلسفے کو پڑھ کر بھی ایک بھولا بھالا چہرہ اس کے سامنے آتا تھا۔ اس کی معصومیت اس کے دل میں چبھنے لگی۔ وہ کیوں اس چہرے کو اتنا قریب پاتی تھی۔ وہ محبت پر ایمان نہیں رکھتی تھی۔ لیکن شاید اس گاؤں کے چھوکرے کی معصومیت نے اس پر نفسیاتی اثر کیا تھا۔ اس لئے اس کا چہرہ اس کے سامنے ہر وقت آتا تھا۔ لیکن اس نے اس چہرے کو ذہن سے جھٹک دیا۔ پھر بھی وہ اس کا تعاقب کرتا تھا۔
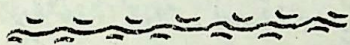
پانچواں باب

آج وہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ سو روپیے کا منی آرڈر ابھی ابھی اس کو ڈاکخانے سے ملا تھا۔ وہ اب بھی سوچتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ کپڑوں کو خریدنے کے لئے کچھ پیسے خرچ کرنے کیلئے تیار ہوا۔

وہ شہر کی ایک اعلے دوکان میں داخل ہوا۔ سیلزمین نے جب اس کو معمولی کپڑوں میں دیکھا تو حقارت سے کہا۔

"کہو کیا چاہیئے۔"

اصغر کو اس کے بولنے کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ وہ سیلزمین سے کہلاتا تھا۔ دوسری طرف ایک آدمی داخل ہوا۔ اس کی پوشاک اچھی تھی۔ لیکن کیا یہ اچھی پوشاک والے اچھا دل بھی رکھتے ہیں۔ سیلزمین اصغر کو نظر انداز کر کے اس ولایتی سوٹ والے کی طرف مخاطب ہوا۔

"حکم کیجئے جناب"

اصغر سماج کے اس انداز سے نفرت کرتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے اصغر کی طرف سلیمہ بیں منتہ جیہ ہوا۔ اس نے دو قمیضوں اور دو پتلونوں کا کپڑا انیس روپے میں خریدا۔ بیس روپے سلائی کے لئے دیئے۔ دو دن کے بعد جب درزی نے اس کو کپڑے دیئے۔ اپنے آپ کو ان ماڈرن کپڑوں میں ملبوس کر کے وہ بار بار آئینہ دیکھتا تھا۔ نصرت نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اجازت ہے"

نصرت خود ہی اصغر کے کمرے میں داخل ہوتی تھی۔ اب شرمیلا پن اس سے دور بھاگ گیا تھا۔ اب وہ شوخ بن گئی تھی۔

"آپ"

"ارے واہ۔ آج تم کہاں بن ٹھن کے جا رہے ہو؟"

"بس کالج جا رہا ہوں۔ تم کیسے آئی ہو؟"

"یوں" اس نے شرماتے ہوئے کہا "میں درگاہ صاحب گئی تھی"

لیکن اصغر سوچ رہا تھا کہ درگاہ جانے میں کونسی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے وہ شرما رہی ہے۔ نصرت نے پھر کہا۔

"تم نے یہ نہ کہا کہ میں کیوں وہاں گئی تھی؟"

"کیوں گئیں تھیں؟"

"منت مانگنے گئی تھی" نصرت نے ہونٹوں کو چبایا پھر اس کا چہرہ

سُرخ ہو گیا۔ اصغر نے حیران ہو کر کہا۔
"مِنّت؟ میں نہ سمجھا"
"مولانا جی ۔ ۔ ۔ ایک بچہ چاہتے ہیں"
پھر وہ یہ کہتے ہی بھاگ گئی۔
اصغر نے سوچا "مولانا جی باپ بننا چاہتے ہیں۔ باپ بننا لیکن اس عمر ۔ ۔ ۔" پھر اس کی نفیس پتلون نے اس کو اس خیال سے چھٹکارا دلایا۔ وہ بار بار اس پتلون کو دیکھ رہا تھا۔ کالج میں جب وہ داخل ہوا تو خلعت ملا۔ یہ وہی لڑکا تھا۔ جس کے ساتھ اصغر کی ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔
"دوستو! آج ہمارا اولڈ ماڈل درست اپ ٹو ڈیٹ اور ہالنگ کر کے آیا ہے"۔
سب لڑکے ہنس پڑے لیکن لگتا تھا۔ اس لباس میں شاندار بیباک نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ خالی گھنٹے میں صنوبر اس سے ملنے آئی۔ اس نے کہا۔
"آج آپ نے اپنے آپ کو نیا بدل گیا"
"ضرورت پڑی"۔
"لیکن نکلے چھپے رستم"۔
"رستم" وہ ہنس پڑا۔ "بیت گیا وہ زمانہ"

"کبھی کبھی تم زیادہ چڑانے کے بات کرتے ہو"
"انداز ہے نرالا۔ خیر آج موسم اچھا ہے"
اصغر نے کہا۔ "جی چاہتا ہے کہ آزاد بہاروں میں گھومنے جاؤں۔ جہاں درخت کے سائے ہوں۔ جہاں بل کھاتی ہوئی ندی ہو۔ اور جہاں مست ڈالیاں پھولوں سے جھک کر زمین کو چوم رہی ہوں"۔
"ہے۔ ایسی جگہ ہے۔ یہاں سے دو میل دور ہے۔ وہاں خاموشی اور تنہائی ہے"۔
"چلو پھر کیوں نا وہاں اکٹھے چلیں"۔
"آ۔ لیکن"۔
"انکار نہ کرنا"۔
"نہ جانے یہ تیری معصومیت مجھے کیوں ہر بات پر مجبور کر رہی ہے۔ خیر چلتی ہوں"۔
وہ چلے بہاروں میں ڈھونڈنے کے لئے شوخ چنچل نظاروں میں خود کو گم کرنے کے لئے۔
اصغر نے صنوبر کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔
"یہ آنکھیں کیوں مجھے اپنا گاؤں یاد دلاتی ہیں۔ معصوم آنکھیں"
صنوبر نے جواب دیا۔

"پیارے مجھے تمہاری ہر طرز میں معصومیت نظر آتی ہے اور اسی معصومیت پر مجھے پیار آتا ہے۔"

"پیار"۔ اصغر اُس کے سنہرے بالوں کو چومتے ہوئے کہتا ہے۔ "محبت مجھے بھی تم سے ہے۔"

"محبت" صنوبر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ لفظ میرے لئے بے معنی سا رہ گیا۔"

"محبت کو بے معنی سمجھتی ہو۔ زندگی کی حسین دھڑکن کو مہمل کہہ رہی ہو۔"

"محبت ہے کیا؟" صنوبر نے کہا۔ "جنسی لگاؤ کا دوسرا نام۔ یہ سب ایک فریب کا نام ہے۔"

"پیاری محبت ہی سب کچھ ہے۔" اصغر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم شادی کے رشتے کے بھی قائل نہیں ہو۔ کیا تم اس کو بے معنی سمجھتی ہو؟"

"نہیں نہیں شادی ضروری چیز ہے۔" صنوبر نے کہا۔

"ہر آدمی کو ایک ہی راہ پر جانے کے لئے طریقہ ہے۔"

"لیکن محبت سے انکار کرتی ہو۔ جس ماں نے تمہیں پالا۔ اس کا اور تمہارا رشتہ کیا تھا۔ جس فطری چیز نے تم کو میرے قریب کیا۔ اس کا کیا نام ہے۔" صنوبر نے کہا۔ "لیکن میں ان باتوں سے قائل

نہیں ہو جاؤں گی۔"

"قائل" اصغر نے کہا۔ "میں کہتا ہوں کہ اب تک تم پر ابھی محبت جاگ ہی نہیں پڑی ہے۔ اور آدمی جب تک ایسے حالات سے دوچار نہ ہو۔ تب تک وہ قائل نہیں ہوتا۔"

"مجھے منطق سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں دنیاوی نظروں سے ہر مسئلے پر سوچنے کی عادی ہوں۔ میں مارکس کے فلسفے کی حامی ہوں۔ جہاں محبت اور شادی کی کوئی وقعت نہیں۔ اب میں جا رہی ہوں۔ تم نئے منطق کے بارے میں سوچ لو۔ بیا ایسے خدا حافظ۔"

اصغر اب تک بہاروں کی آمد میں کھویا ہوا تھا۔ لیکن بہار چلی گئی۔ اب تک جس محبت کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ وہ سراب تھا۔
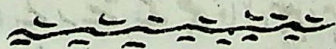
چھٹیوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ پانچ دن کے بعد کالج بند ہونے والا تھا۔ سب ہی لڑکے چھٹیوں کا پروگرام بنا رہے تھے۔ عظمت صاحب اپنے پہاڑی بنگلے پر جانے والے تھے۔ جو شہر سے پانچ میل دور تھا۔ اصغر گاؤں جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ صنوبر اور اصغر میں اب بھی ناراضگی بدستور تھی۔ صنوبر اس خیال میں محو تھی کہ کوئی نہ کوئی لڑکا شہر رہ جائے تو ہوٹل اور سینما ہاؤس کی خوب سیر ہو گی۔ خیر ہر ایک اپنے اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔

صنوبر جب گھر پہنچ گئی اپنی ماں کو بستر میں پایا۔ صنوبر ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔

"کیوں ماں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں بیٹی سر چکرا سا گیا" اس نے کہا۔ "اب میں ٹھیک ہوں۔"

"ماں اپنا خیال رکھنا! ڈاکٹر نے پچھلی بار بھی کہا کہ تم چائے کے

پاس نہ جانا۔ ہاں بلڈ پریشر کے لئے پرہیز کا بڑا اسفر ہے۔ میں خود ہی کھانا دیا کروں گی۔"

"بیٹی تم کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ گھبرا گئی ہو۔"

اس لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی ماں نے کہا۔

"دیکھو بیٹی کون ہے؟"

صنوبر نے دروازہ کھولا اور اپنے سامنے خاکی وردی میں ایک آدمی کو پایا۔ صنوبر نے کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"یہاں حنا بیگم رہتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"یہ سمن لیجئے۔"

"سمن کس بات کے لئے۔"

"محترمہ" اس نے کہا۔ اس وقت اس کی ماں بھی آگئی۔ "جی یہ نواب تیمور جنگ کے بیٹے نواب حیرت جنگ آپ کو بذریعہ عدالت آگاہ کرتے ہیں۔ کہ یہ مکان آپ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر خالی کیجئے ورنہ آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔"

"نہیں"

حنا بیگم چیخ پڑی اور پھر وہ گر گئی۔ صنوبر ماں پر رو تے ہوئے

گر پڑی۔

"ماں! ماں کیا ہوا؟"

محلے کی عورتیں یہ شور و غل سن کر جمع ہوئیں۔ وہ صنوبر سے پوچھنے لگیں۔

"صنوبر بیٹی کیا ہوا؟"

"میری ماں کو کچھ ہوا ہے۔"

"گھبراؤ مت بیٹی۔ خدا سب ٹھیک کرے گا۔"

ایک بوڑھی عورت نے صنوبر کو تسلی دی۔ صنوبر نے کہا۔ "آپ میری ماں کے پاس رہیں۔ میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔"

"جاؤ بیٹی جلدی کرو۔"

وہ دوڑتی ہوئی ڈاکٹر کے پاس جانے لگی۔ سارے شہر کو رات نے اپنی آغوش میں لیا تھا۔

دوا خانے پہ اُس کو عظمت ملا۔ عظمت نے جب صنوبر کو پریشان حالت میں دیکھا۔ اُس نے کہا۔

"کیوں صنوبر کیا ہوا؟"

"میری ماں سخت بیمار ہے۔"

"ماں بیمار ہے۔ چلو ڈاکٹر کو بلالیں گے۔"

عظمت اپنے ساتھ ڈاکٹر کو لایا۔ ڈاکٹر مریض کا

تھا۔ معائنہ ختم کر کے ڈاکٹر نسخہ لکھ رہا تھا۔ عظمت نے کہا۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے؟"

"بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔" اس نے کہا۔ "چار گھنٹے کے بعد ہی ......"

"نہیں ڈاکٹر۔" صنوبر چیخ پڑی۔ "میری ماں میرا آخری سہارا ہے۔ مجھ سے اس کو مت چھین لو۔ میں کیا کروں گی۔" عظمت نے صنوبر کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"صنوبر۔ یہ وقت رونے کا نہیں ہے۔ ہمت سے کام لو۔ جا ماں کی خدمت کرو۔"

"ماں۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ ماں کے پاس گئی۔ تھوڑی گھنٹے کے بعد اس کی ماں نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی ماں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کہاں ہے میری بیٹی صنوبر۔"

صنوبر نے روتی آواز میں کہا۔ "ماں میں تمہارے پاس ہوں"

"آ۔ میرے قریب آ۔" اس کی ماں نے کہا۔ "میں جا رہی ہوں بیٹی.... جا رہی ہوں۔ لیکن تم اکیلی اس اتنی بڑی دنیا۔ لیکن خدا..... ہاں خدا کے حوالے کرتی ہوں۔" وہ تھک گئی۔ ا

کے دم نے ساتھ نہ دیا۔ اور وہ مر گئی۔

عظمت نے صنوبر کی ماں کو سپردِ زمین کیا اور پھر وہ صبح چھ بجے مقبرے سے واپس آیا۔

صنوبر اب تک روتی ہی تھی۔ ماں کے ہوتے ہوئے اس کو کسی بات کی فکر نہ تھی۔ وہ اب تک غزالوں کے سہارے زندگی کاٹ رہی تھی۔ لیکن اب زندگی اس کے لئے ایک بوجھ بن گئی۔ وہ کس سہارے یہ زندگی کاٹ لے۔ چند گھنٹوں کے بعد بھی یہ مکان اس کو خالی کرنا ہے۔ جس میں اس کا بچپن پروان چڑھا تھا۔

عظمت نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ صنوبر وہ چلی گئی۔ اب سنبھالو اپنے آپ کو، ہمت سے کام لو۔"

"لیکن عظمت میں کیا کروں؟" سنجیدہ ہو کر اس نے کہا۔ "میرا ابو سب چلا گیا، ماں تھی، وہ بھی چلی گئی۔ یہ مکان ہے یہ بھی چند گھنٹوں کے بعد چلا جائے گا۔"

"تو" عظمت نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اب تو تمہارا کچھ نہیں رہا۔ میرے ساتھ شادی کرو گی؟"

صنوبر نے حیران آنکھوں سے عظمت کی طرف دیکھا۔ عظمت ایک امیر باپ کا ایک امیر لڑکا تھا۔ اس کی یہ پیشکش، وہ مسرت سے چیختا

چاہتی تھی۔ وہ دنیا سے کہنا چاہتی تھی۔ وہ جس چیز کی تلاش میں تھی۔ وہ اس کو مل گئی۔ ہاں وہ مل گئی۔ ایک معصوم چہرہ اس کے سامنے آتا تھا۔ اس نے اس چہرے کو نوچ ڈالا۔ اس نے کہا۔

"عظمت کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں بالکل سچ ہے"

"میں تیار ہوں۔ عظمت میں تیار ہوں"

"پھر ہم صبح کی گاڑی سے اباجان کے پاس جائیں گے۔ ان سے اجازت لے کر شادی کرلیں گے"

"لیکن"

"فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میری بات نہیں ٹالیں گے۔ ہاں تم اپنے کپڑے باندھ لو"

"اچھا"

اس کو ہر لمحے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس نے جو خواب دیکھا۔ وہ سچ بن کے اس کے سامنے آگیا۔ وہ اب رانی بن جائے گی۔ لیکن یہ اصغر کی صورت کیوں خیالوں میں آتی ہے۔ اس کے ماتھے پر تیور چڑھ گئے۔

"بیہودہ آدمی"

وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ اب وہ عظمت کے ساتھ ایک

نئی منزل پر جا رہی تھی۔
لیکن اصغر نے جب صنوبر کو کالج میں نہ پایا۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔ بُرے خیالات اس کے دماغ میں آتے رہے۔ چھٹی ہونے کے بعد وہ صنوبر کے مکان کی طرف گیا۔
اصغر نے مکان کے دروازے پر ایک بڑا تالا پایا۔ وہ حیران ہوا۔ اس نے پڑوسی سے پوچھا۔
"بھیا یہ گھر والے کہاں چلے گئے۔"
"چلی گئی" اس پڑوسی نے کہا۔ "زمانہ کیا آیا ہے بابوجی۔ اس لڑکی کی ماں مر گئی اور لڑکی ادھر ایک من پسند لڑکے کے ساتھ شادی رچانے کے لئے اس کے ساتھ چلی گئی۔ بے حیائی کا زمانہ!!"
پڑوسی بڑبڑاتے ہوئے چلا گیا۔ لیکن اصغر وہیں کھڑا رہا۔ خیالوں کی عمارت جو اس نے مدت سے تیار کی تھی۔ وہ چند گھنٹوں میں چکنا چور ہو کر رہ گئی۔
عشق کی یہ ہار اس کے معصوم دماغ کو ستا رہی تھی۔ وہ صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ وہ چیخ اٹھا۔ لیکن سب فنا ہو گیا تھا۔ ایک شرابی چلتے ہوئے اس کے پاس آیا۔ اس نے کہا۔
"روتے ہو پیارے۔ خوب رو لو۔ ماتم مناؤ۔ لیکن پیارے اگر دنیا کو بھول جانا چاہتے ہو۔ تو پی لو۔ جی بھر کے پی لو۔ یہ دیکھو"

اُس کے ہاتھ میں سرخ شراب کی بوتل تھی۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ ہر مرض کی دوا ہے۔ یہ سرخ شراب، یہ شراب ہاں ... یہ شراب پی لو۔"

اصغر نے بوتل اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔ بوتل کو دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔

"ہاں زخمی دل کا اور کوئی علاج نہیں۔"

شراب پی لی اور شراب نے اس کے حواس چھین لئے۔ جب شیشے کی بوتل اس کے ہاتھ سے پھسل کر گر پڑی۔ تب بوتل لڑھکتے ہوئے آگے چلی گئی۔ وہ بوتل کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اُس نے اپنی بہکی ہوئی آواز میں کہا۔

"اے ... اے کہاں بھاگ رہی ہو۔"

آخر جب وہ ہاتھ نہ آئی تو اس نے کہا۔

"تو بھی دغا دے گئی۔"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے چلنے لگا۔ ایک مکان کی دیوار سے اُس کی ٹکر ہو گئی۔ ماتھے پر زخم آیا۔ خون بہنے لگا۔ اُس نے کہا۔

"محبت میں ہار گیا اور خون بہنے لگا۔ یہ خون اور محبت ... ہا ... ہا ... ہا ..." وہ ہنس پڑا۔ "اچھا ہے۔ سب کچھ

اچھا ہے۔"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں پہونچ گیا۔ نصرت اُس کے کمرے میں موجود تھی۔ نصرت کو دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔

"کون ہو تم؟"

"میں نصرت ہوں۔ تم نے شراب پی رکھی ہے۔"

"شراب" قہقہے لگاتے ہوئے اُس نے کہا۔ "شراب پی تھی اب نہیں۔"

"اگر مولانا جی کو معلوم ہو گیا تو وہ تمہارے سر کو اپنے گول ڈنڈے سے درست کریں گے۔"

"جی .... مولانا جی .... ہاہا .... کہاں ہے وہ؟

"وہ گاؤں چلے گئے۔"

"گاؤں" اصغر کو جیسے کچھ یاد آیا۔ "میرے گاؤں جہاں چھوٹے چھوٹے درخت ہیں۔ جہاں ایک ندی بہتی ہے۔ جہاں چرواہے اپنی سریلی دھن میں بنسری بجاتے ہیں۔"

"تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"

"ہوش"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے چارپائی کے بدلے نصرت پر گر گیا۔ نصرت نے اس کو اپنی باہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"

"یہ تم کیا کرتی ہو۔"

"تم بہت اچھے ہو۔"

"میں اچھا کہاں ہوں"۔

اندر دور ایک بجلی کی چمک اٹھی۔ زور زور سے بارش آنے لگی۔ بارش کے بعد سارا مطلع صاف ہو گیا۔

صبح کا آغاز ہوا۔ نصرت نے اصغر کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ وہ بیدار ہوا۔

"تم ...... تم میرے بستر۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو۔"

"ہونے اچھے"

نصرت نے ایک بار پھر اس کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ اپنے آپ کو ان باہوں سے آزاد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جذبات کی کشمکش میں یہ کوشش ناکام ہو گئی۔

اس نے کپڑوں کو سوٹ کیس میں بند کیا۔ اصغر اب جانے کے لئے تیار ہوا۔ نصرت داخل ہوئی۔

"تم جا رہے ہو"

"ہاں گاؤں جا رہا ہوں"۔

"واپس کب آ رہے ہو" اس نے بے دلی سے سوال کیا۔ اصغر نے کہا۔

"چھٹیاں ختم ہونے کے بعد"

"اچھا یہ لو مٹھائی"

"نہیں مجھے نہیں چاہیئے"

"کیوں نہیں؟ یہ گھی میں بنی ہوئی مٹھائی ہے۔ طاقت فروری چیز ہے"

"طاقت"

اس نے سرد آہ بھری۔ اب اس کو گاؤں یاد آیا۔ گاؤں کا کلیسا یاد آنے لگا۔ وہ شہر کے ہنگامے سے دور بھاگ جانا چاہتا ہے۔ وہ سکون سے چند لمحے گذارنا چاہتا تھا۔

سکون ... سکون۔ اس سے کوسوں دور بھاگ گیا تھا۔ اب تو سوز و غم اس کا ساتھی بن گئے۔

آہ و فغاں و سوز و غم ساتھی بنا سب میرے
اور اس پر طرہ یہ ہے کہ شاہد نہیں ہوں میں
دہشتی

لیکن اس کو ایک اور حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا باپ علیل تھا اور زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا۔ اس کے رشتہ داروں نے کہا۔

"اصغر ہم نے شہر آپ کو تار بھیجا تھا۔ ملا نہیں"

"نہیں میں کل ہی روانہ ہوا تھا۔"

"ابا جان کو کیا ہوا؟"

وہ دوڑتا ہوا والد کے پاس گیا۔ اُس نے اپنے والد سے کہا۔

"ابا جان کیا بات ہے؟"

"بیٹا بس معمولی سا بخار آیا ہے۔"

"ابا جان آپ کی یہ حالت ہوئی اور آپ نے مجھے بلایا تک بھی نہیں۔"

"میرے بیٹے" اُس کے والد نے اس کے سوال کو نظر انداز کیا۔

"تم ٹھیک طرح سے پہنچ گئے تکلیف تو نہیں ہوئی۔" لیکن اصغر پریشانی کے عالم میں ڈوب گیا۔ وہ تیمہ آگیا۔ لیکن وہ بھی مایوسی میں سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ اس کا والد کہہ رہا تھا۔

"میں چلا جاؤں گا۔ لیکن تو بھولا ہے۔ تو ... تو کیا کرے گا؟ ... تو کیا ....؟"

لیکن اس کا بیٹا چیخ پڑا۔

"ایسا مت کہو ابا جان ... ایسا مت کہو ابا جان"

لیکن ابا جان چلا گیا اور اس کو اندھیروں میں بھٹکتا ہوا چھوڑا۔ موت کے ظالم پنجوں نے اُس سے اُس کا آخری سہارا چھین لیا۔ وہ بہاروں کے ان نظاروں میں ہر سو خزاں کی آمد پاتا تھا اس کا اپنا دل جل گیا۔ وہ کیا کرتا؟ اس کو ایسا لگتا تھا۔ جیسے سارے

جہاں میں آگ لگ گئی ہو۔

دن بھر پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کو سکون دل نہیں ملتا تھا۔ جو اس سے دور ہو گیا تھا۔ اپنا سب کچھ اس نے کھو دیا تھا۔

لیکن، کب تک وہ ان پہاڑوں اور جنگلوں میں اپنی زندگی کاٹتا اور آخر ایک دن شہر واپس چلا گیا اور پھر ایک کالج میں داخل ہو گیا اور اپنے دل میں عہد کیا کہ تن من لگا کے تعلیم حاصل کریگا۔ اور اپنے مرحوم باپ کی خواہش کو پورا کرے گا۔

ساتواں باب

عظمت نے اپنے خلاف مخالفتوں کا طوفان کھڑا کیا۔ لیکن جنوبی
کے حسن کے لئے وہ ہر قسم کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار تھا۔ اس کے
باپ نے جائداد سے الگ کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن یہ خطرہ بھی وہ مول
لینے کے لئے تیار رہا۔ پھر بھی وہ والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کو
آخر بیٹے کے فیصلے کے سامنے جھک جانا پڑا۔ ان لوگوں نے جنوبی
کو بہو کے طور منظور کیا۔ لیکن اس کے لئے ان لوگوں کے دلوں میں ایک
کھٹک پیدا ہوئی۔ عظمت کی شادی کے لئے اس کے ماں باپ
نے بہت سے منصوبے باندھے تھے۔ لیکن سب کے سب دھرے
رہ گئے۔ عظمت کی ماں کا سلوک بھی اس کے ساتھ اچھا نہ تھا
وہ اکثر اپنی پڑوسی سہیلیوں سے کہتی تھی۔

"میں کہتی ہوں اس کا خاندان ہی ایسا ہوگا۔ جو کھیلے کھائے
نوجوان کو پھنسانے میں ماہر ہوگا۔ لیکن میری کون مانتا ہے۔ اب
دیکھو نا! عظمت بیچارا ابھی سمجھتا ہے کہ یہ شریف لڑکی صرف اس

ملتی ہے۔ لیکن میرے سفید بال کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی لیا ہے۔"

ایسی باتیں سن کے اس کو بہت غصہ چڑھتا تھا۔ لیکن وہ خاموش ہو تی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا۔ چند دنوں کے بعد یہ بوڑھا اور بوڑھی مر جائیں گے اور پھر اس عظیم اسٹیٹ کی مالک بن جائے گی اور تب وہ رانی بن کے راج کرے گی۔

عظمت اس پر مہربان تھا۔ صنوبر کے بولنے کا انداز اس کو متاثر کرتا تھا اور کبھی کبھی وہ بے اختیار ہو کر بولتا تھا۔

"صنوبر میری جان! میں کتنا خوش نصیب ہوں، جو تیرا ساتھ ملگیا"۔

عظمت کی مہربانیوں کے باوجود بھی اس کے خوابوں میں ایک اور آدمی چلا آتا تھا۔ وہ بھولا بھالا چہرہ اُس کے لاشعور میں چل کر اس کو پُرانی باتیں یاد دلاتا تھا۔ اکثر لمحے وہ اپنے آپ سے عاجز ہو جاتی تھی اور خود ہی کہتی تھی کہ کیوں اس آدمی کے ساتھ میری لگن ہو تی تھی۔ لیکن یہ یادیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

عظمت لمبے سفر کے لئے تیار ہوا۔ صنوبر کو اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا

"پیاری تھوڑے عرصے کے لئے تم سے دور ہو رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں؟ کام ہی ایسا آن پڑا۔ خیر فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں تم کو ایک اچھی خبر سنانے والی تھی۔" صنوبر نے کہا۔ "لیکن
مجھ سے دور ہو رہے ہو۔ نہ جانے یہ پل کیسے بیت جائیں گے۔"
"کہو پیاری کونسی خوشخبری تم سنانے والی تھی۔ اب کیوں خاموش
ہو۔ میں کم از کم یہ دوری کے دن اُس خوشی کے سہارے ہی کا
لینا چاہتا ہوں۔"
"نہیں میں نہیں کہوں گی۔"
صنوبر نے شرماتے ہوئے کہا۔ عظمت نے اس کو گلے لگاتے ہو
"کہو کیا بات ہے؟"
"تم" پھر اُس نے اپنا چہرہ اس کے سینے کے ساتھ لگا کر کہا
باپ بننے والے ہو۔" عظمت خوشی سے چیخ پڑا۔
"میں باپ بننے والا ہوں۔ آہا . . . . یہ خوشخبری اب تک
سے چھپا کے رکھی تھی۔ کیوں؟ ۔ میری امی مجھے بھی ان باتو
بے خبر رکھتی ہیں۔"
صنوبر اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے۔ عظمت نے
"اچھا دیکھو میری غیر حاضری میں اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ میں جل
واپس آؤں گا۔ میں تمہارا خیال خود رکھوں گا۔ اچھا خدا حافظ"
عظمت کے جانے کے بعد ساس اور سسر کا برتاؤ اس کے سا
اور بھی سخت ہو گیا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اب وہ لوگ اس کا بال

بیکھ نہیں کریں گے۔ کیونکہ اب اس گھر کا نیا مالک آ رہا ہے۔

بیس دن کے اندر عظمت کا تار ملا۔ وہ گھر واپس آ رہا تھا۔ صنوبر نے اپنے آپ کو خوب سجا کے رکھا۔

لیکن یہ سجاوٹ کس کے لئے۔ اچانک ان لوگوں کو یہ خبر ملی کہ جس ریل سے عظمت سفر کر رہا تھا۔ اس کا حادثہ ہوا۔ اور مرنے والوں میں عظمت بھی تھا۔ عظمت کا سہارا چھین گیا۔ وہ روتی رہی اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک امیر کا گھر ملا تھا۔ لیکن قدرت کو اس کی یہ خوشی کیا نہ سکی۔ وہ اس کو برباد کرنے پر تلی تھی اور آخر برباد کر کے ہی رکھا۔ اس کی زندگی نے کئی کروٹیں کھائیں۔ اس نے سوچا اب وہ بیوگی کے دن ہی اس گھر میں کاٹے گی۔ لیکن اس کی ساس نے کہا۔

"یہ منحوس عورت ہے۔ اس کا سایہ بھی منحوس ہے۔ پہلے تو اس نے ہم سے ہمارا بیٹا چھین لیا اور پھر اس کی منحوس نظر نے اس کو موت کی بھینٹ چڑھا دیا۔" صنوبر نے روتے ہوئے کہا۔ اماں جی آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔ آپ ہی اب میرے سب کچھ ہیں۔"

بڑھیا نے غصیلی آواز میں کہا۔

"میں جانتی ہوں تم ناگن ہو۔ تم ہم سب کو ڈس لینا چاہتی ہو۔ تاکہ اس شاندار اسٹیٹ پر تمہارا قبضہ ہو جائے۔ اس لئے تم نے

عظمت کے ساتھ شادی کی تھی لیکن اب یہ ناگن اس گھر میں نہیں رہیگی۔"
صنوبر نے سسر سے کہا۔

"اباجی! آپ ہی انصاف کیجئے۔ میں کہاں جاؤں؟ اور پھر دوسری
جان۔۔۔۔"

"ڈھونگی عورت"۔ اس کے سسر نے اس کو دھکیلتے ہوئے کہا۔
"یہ نیا ڈھونگ رچایا ہے۔ ڈائن ہمارا بیٹا کھا کے تمہارا پیٹ نہیں
بھرا ہے۔"

صنوبر چیختی رہی۔ لیکن وہ چیخیں کون سنتا۔ عظمت قبر میں
سویا ہوا تھا۔ اب وہ کس سے فریاد کرے۔ کس کو کہے اس کے
ساتھ کیا ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ جو دوسری جان تھی۔ اس کا
کیا ہوگا۔ اب یہاں اس کو کچھ نہیں ملے گا۔ مایوسیوں کے بادل
ہر طرف چھائے ہوئے تھے اور وہ ان مایوسیوں میں آگے بڑھ
رہی تھی۔ لیکن اس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جائے؟ اور
کس کے پاس جائے؟

آٹھواں باب

نصرت اُس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیب تھا۔

اصغر نے سوال کیا۔

"کیوں ہنس رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" ہنستے ہوئے اُس نے کہا "سیب کھاؤ گے۔"

"نہیں تو"

"بڑا اچھا سیب ہے۔ کھٹا ہے۔"

"کھٹا"

"ہاں"

وہ پھر ہنس پڑی اور اس کے ساتھ ہی بھاگ گئی۔ اصغر بڑبڑایا۔

"کھٹا"

مولا بخش اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"برخوردار کیا کر رہے ہو۔"

"جی کالج جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ آج آپ خوش خوش نظر
آرہے ہیں۔ کیا بات ہے؟"

"درگا والے بابا نے ہماری فریاد سن لی۔"

"کیا مطلب؟"

"بیٹے منت بھر آئی۔ میرے گھر میں اولاد آرہی ہے۔"

"اولاد۔"

اصغر قہقہہ لگاتا ہے۔ لیکن یہ قہقہہ ایک خاموش قہقہہ تھا۔
وہ دنیا سے کیا چاہتا تھا۔

"مولانا جی کی اولاد"۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

یہ چودھری یہ خبر ہی دیکھ کر اس کا دل بجھا جاتا تھا۔ تب وہ
وہ اس دنیا سے فرار چاہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو جلتا ہوا محسوس
کرنے لگا۔

"ارے بخار آگیا ہے۔ چلو ہسپتال چلیں۔"
تحصیلدار کے بیٹے نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
اصغر نے کہا۔

"نہیں دوست کوئی ایسی بات نہیں ہے۔"

"چلو بھئی ہسپتال! خواہ مخواہ اپنی جان کے دشمن بن جانے بیٹھے۔
آخر ہو گیا ہے۔ نہیں۔" اصغر خاموش رہا۔ تحصیلدار کے بیٹے نے اس کو

ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

دونوں ملک کے بڑے ہسپتال میں داخل ہوئے سرکاری ہسپتال میں مفت علاج کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن رشوت کے بغیر کہیں بھی کام چلتے ہوئے محسوس نہیں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نے اصغر کا معائنہ مختصر کیا اور اس نے کہا۔

"جناب آپ کو اپنی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ ورنہ یہ کار آپ کے لئے بہت ہلاکت ثابت ہوگا۔ ہاں ایک بات کہیے۔ آپ کو کھانسی تو نہیں آتی"۔

"جی نہیں"۔

ڈاکٹر نے نسخہ لکھ کر اصغر کے ہاتھ میں سونپ دیا۔

دوائی خرید کر اس کے دوست نے اپنے گھر کا راستہ لیا اور وہ بھی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

وہ اپنے آپ کو تھکا ہارا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن وہ لڑکھڑاتی ہوئی چال میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔

مولانا جی بھاگا جا رہا تھا۔ اصغر نے کہا۔

"مولانا جی آپ اس طرح کیوں بھاگ رہے ہیں خیریت تو ہے"؟

"بٹیا نصرت کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ مجھے ڈاکٹر کو بلانا ہے۔ اچھا میں جاتا ہوں"۔

مولانا جی یہ کہتے ہی چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ کمرے کے دروازے کے سامنے صنوبر کو پایا۔ وہ بار بار اس کو تکتا رہا۔ وہ حیران ہوا۔ حیرانگی میں اس نے سوال کیا۔

"تم...... تم اس وقت"

"ہاں"

صنوبر نے سوال کا جواب دیا۔ اصغر نے کہا۔

"میں نے سنا تھا تم نے شادی کی تھی۔ لیکن تمہارا خاوند ساتھ نہیں آیا۔"

"اصغر یہ طنز کا موقعہ نہیں ہے۔" صنوبر نے مایوس کن لہجہ میں کہا۔ "میرے خاوند مر گئے اور اس کے ماں باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا۔"

"یہ ظلم ہے۔"

اصغر سے یہ برداشت نہ ہوا کہ صنوبر کو گھر سے نکال دیا جائے۔ لیکن صنوبر نے اس کے ساتھ جو ظلم کیا تھا۔ وہ اس کو یاد بھی نہ رہا۔ صنوبر کے لئے اس کا دل ایک بار پھر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ صنوبر نے اس کے بدلتے ہوئے چہرے کو دیکھ لیا۔ اس لئے اس نے کہا۔

"میں...... میں حاملہ ہوں۔"

"حا... حاملہ... تو... کیا؟... اور تم اس حالت میں

یہاں ... تم کو آرام کی ضرورت ہے۔"
اس کو اپنی صحت کا کچھ بھی خیال نہ رہا۔ وہ خود بخار میں جل رہا تھا۔ لیکن صنوبر کی صحت کے سامنے وہ اپنا سب کچھ بھول گیا۔
وہ شہر کے ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ منیجر کے پاس گیا۔ اصغر نے کہا۔
"جناب مجھے ایک کمرہ چاہیئے۔"
"ضرور ... بیس روپے کرایہ دینا پڑے گا۔"
"جناب ہاں دینے کے لئے تیار ہوں۔"
"اچھا کمرہ نمبر بیس آپ کے لئے حاضر ہے۔"
اس نے کمرے کی کنجی سنبھالی۔ بیرے نے صنوبر کا سامان اٹھایا وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ اصغر نے کہا۔
"لو۔ یہ تمہارا کمرہ ہے۔ اب تم آرام کرو۔ میں کل ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔"
"اصغر تم کتنے اچھے ہو۔" صنوبر اس کے قریب ہوتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم سچ مچ بھولے ہو۔ تم سب کچھ بھول جاتے ہو۔" اصغر نے کہا۔
"یہ وقت ان باتوں کے سوچنے کا نہیں۔ تم آرام کرو اور اپنی صحت کا خیال رکھنا۔" صنوبر اس کے اور قریب ہو جاتا ہے۔
"اس بھولے پن پر مجھے پیار آجاتا ہے۔"
"پیار پر تمہیں یقین ہی نہیں۔"
"لیکن اب یقین آتا ہے۔"

صنوبر اصغر کو اپنی باہنوں میں سمیٹ لیتی ہے۔ لب سے لب مل
گئے ہیں۔ صنوبر نے کہا۔

"ہاں بیمار ہے مجھے تم سے۔"

"بیمار؟"

اصغر اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ صنوبر اچانک
کہتی ہے۔

"تمہیں بخار ہے۔"

"معمولی سا ہے۔ رات بھر میں اتر جائے گا۔ اچھا اب تم آرام کرو
میں گھر جاتا ہوں۔"

اصغر اس کو خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ وہ علی الصباح ہی
نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کو صنوبر کے لئے ڈاکٹر کو لانا تھا
لیکن اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اٹھ سکے۔ بخار نے اس کو بری
طرح گھیر لیا۔ لیکن ڈاکٹر لانا تھا۔ صنوبر کا علاج کرانا تھا۔ وہ جانے
کے لئے تیار ہوا۔ مولانا جی داخل ہوئے۔ انہوں نے کہا۔

"خوشخبری سن لو... ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔"

"مبارک ہو۔"

"ہاں بیٹا آخر ہماری مراد بر آئی۔"

"مراد"

"ہاں مراد بر آئی" اس نے سرد آہ بھری۔ اس جہاں میں ایسا ہوتا ہے۔

اصغر لڑکھڑاتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس روانہ ہوا۔

صنوبر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈاکٹر آیا۔ اس نے صنوبر کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

اب بہت جلد ہے۔ اس کو نرسنگ ہوم میں داخل کرا لیجئے۔ دیکھئے ڈلیوری کے دوران احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں مسز اوشا کھنہ سے آپ کے بارے میں بات چیت کروں گا۔ ہاں مسٹر اصغر اس کو آپ آج ہی داخل کرا دیں تو اچھا ہوگا۔

"بہت اچھا ڈاکٹر صاحب"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اصغر نے صنوبر سے کہا۔

"اچھا تم آرام کرو میں نرسنگ ہوم میں کمرہ دیکھ کر آتا ہوں"

"تم کو میری وجہ ......"

"بس کچھ مت کہو" اصغر نے جاتے ہوئے کہا۔

اصغر نے نرسنگ ہوم میں کمرہ حاصل کیا۔ پھر نرسنگ ہوم میں صنوبر کو بھرتی کیا اور ایک ڈاکٹر کے پاس جا کر اصغر نے اس سے کہا۔

"جناب مجھے ایسی دوائی دیجئے کہ میں چند گھنٹوں میں ٹھیک ہو جاؤں۔"

"لیکن آپ کو تو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔"

"کچھ بھی کیجئے ڈاکٹر لیکن میرا چند گھنٹوں تک ٹھیک ہونا ضروری ہے۔
ایک کام آن پڑا ہے۔"
ڈاکٹر نے دوائی لکھ کر دی "ہو سکتا ہے اس دوائی سے چند دنوں
کیلئے بخار دب جائے۔ لیکن بیماری اس کے جسم میں لگ گئی ہے"۔
اصغر متواتر دو راتیں بیدار رہا۔ وہ برابر صنوبر کی خدمت
کرتا رہا۔ صنوبر کہتی تھی۔
"آپ میری خاطر۔۔۔"
"جان میری میں نے تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کیا"۔
اور پھر تیسرے دن صنوبر کی ڈیلیوری ہوئی۔ لیکن بچہ مرا ہوا
پیدا ہوا۔ صنوبر رو رہی تھی۔ اصغر نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔
"صنوبر یوں اپنے آپ کو ہلکان مت کرو۔ خدا کو یہی منظور تھا اور
ہمیں خدا کے کرنے پر تو رضا رہنا چاہیئے۔"
لو صنوبر کے یہ آنسو مگر بچے کے آنسو تھے۔ وہ تو خوش تھی
کہ ایک بلا سے نجات ملی۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ یہ بچہ اس کا
جینا دوبھر کر دیگا۔ کئی جوان عورتیں شاید صنوبر کے اس خیال سے
اتفاق کرتی ہیں۔
اس کی صحت روز بروز ٹھیک ہونے لگی۔ لیکن اصغر ہر روز اپنے
آپ کو بیمار محسوس کرتا چلا جا رہا تھا۔

صنوبر کو نرسنگ ہوم سے چھٹی ملی۔ اور اب وہ نرسنگ ہوم سے ہوٹل میں منتقل ہوئی۔ صنوبر نے ہوٹل کے کمرے میں بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اصغر آج میں بہت خوش ہوں۔ آج مجھ کو خوب پیار کرلو۔"

صنوبر نے اصغر کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ صنوبر نے کہا۔ "لیکن تمہیں بخار ہے"

اصغر نے اپنے آپ کو چکراتا ہوا محسوس کیا۔ وہ نیچے بیٹھ گیا۔ صنوبر نے کہا۔

"چلو پلنگ پر۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"آرام"

وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ لیکن آرام اس سے کوسوں دور بھاگ گیا تھا۔

تحصیلدار کا بیٹا آیا۔ صنوبر کو دیکھا تو اس نے کہا۔

"آپ یہاں؟ لیکن اصغر کہاں ہے؟"

"وہ بیمار ہوا۔"

وہ دونوں اصغر کے قریب آگئے۔ تحصیلدار کے بیٹے نے اصغر کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ تو بخار سے جل رہا ہے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔"

تحصیلدار کے بیٹے نے ڈاکٹر کو لایا۔ ڈاکٹر نے دوائی دی۔ تحصیلدار کے بیٹے نے صنوبر کے افسردہ چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"آپ تو بہت تھک گئی ہیں۔ آیئے باہر تک ہو آئیں۔"

"لیکن۔"

"فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔
وہ دونوں باہر چلے گئے اور اصغر نیند میں آغوش میں ہچکولے کھا
رہا تھا۔
تحصیلدار کا بیٹا اور صنوبر ایک مقامی ہوٹل میں داخل ہوئے
تحصیلدار کے بیٹے نے کہا۔
"آپ اور اصغر۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ یہ سب کیا ہے"؟
"جی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں اصغر سے ملنے آئی تھی۔
اصغر کو بیمار پایا اور اس کی خدمت میں لگ گئی"۔
صنوبر نے حقیقت کو گول کیا۔ تحصیلدار کے بیٹے نے کہا۔
"تو یہ عشق و محبت کی داستان ہے"؟
"جی۔۔۔۔ کیا۔۔۔؟"
"لیکن آپ تو پڑھی لکھی لڑکی ہیں اور وہ گاؤں کے ایک معمولی کسان کا
لڑکا ہے۔ آپ کا اور اس کا سمبندھ مضحکہ خیز سا لگتا ہے"۔
"کیوں ہے؟"
"تم رانی ہو۔ لیکن وہ راجہ نہیں ہے۔ راجہ میں ہوں جس کے پاس
گاؤں میں تین سو کنال زمین۔ دودھ کا ایک بہت بڑا فارم ہے اور باپ
تحصیلدار ہے"۔
صنوبر سوچنے لگی۔ اس کے پاس تو ایک چھوٹی سی ریاست ہے اور

اصغر کے پاس صرف ایک پیار بھرا دل ہے۔ تب کارل مارکس کا فلسفہ اس کے ذہن میں اٹک جاتا تھا۔

"پیار ایک بے معنی چیز ہے۔"

وہ تب تک یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کس کا ساتھ دے۔ دولت کا یا پیار کا۔ فی الحال وہ دونوں کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی۔ صنوبر نے کہا۔ "سوچنے کی بات ہے۔"

"ہاں جان من" تحصیلدار کا بیٹا بے تکلف ہو گیا۔ "زندگی کو حقیقت کی نظروں سے دیکھو۔ دولت ہی سب کچھ ہے دنیا میں۔"

وہ انکار نہ کر سکی۔ لیکن اصغر جب نیند سے بیدار ہوا اور اپنے پاس صنوبر کو نہ پایا۔ وہ پریشان ہو گیا۔

بجلی کی روشنی سے سارا شہر چمک رہا تھا۔ وہ گھبرا ہوا اُٹھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ اچانک اس کی نظر سامنے پڑی۔ اُس نے جو کچھ دیکھا وہ قابل یقین نہ تھا۔ تحصیلدار کا بیٹا اور صنوبر ایک دوسرے کے سہارے مست چال چل رہے تھے۔ ہوٹل کے گیٹ پر تحصیلدار کے بیٹے نے صنوبر کا الوداعی بوسہ لیا۔

اصغر کے تن من میں آگ لگ گئی۔ یہ عورت ذات کیسی ہے۔ اس کا اصلی روپ کیا ہے۔ حقیقت میں کیا ہے۔ وہ جان نہ پایا۔ اُس نے اپنا سب کچھ صنوبر پر نچھاور کیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر

دوسرے کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔

صنوبر ہنستی ہوئی داخل ہوئی۔ اس نے کہا۔ "پیارے تم کھڑے کیا کر رہے ہو۔ ڈاکٹر نے تمہیں مکمل آرام کرنے کے لئے کہا ہے۔ چلو بستر میں سو جاؤ۔" پھر اصغر کے ہونٹوں کو چومتے ہوئے کہا۔

"کتنے اچھے ہو تم۔"

"کون ہو تم؟" اصغر نے دم توڑتی ہوئی آواز میں کہا۔

صنوبر نے حیران کن لہجہ میں کہا۔

"مجھے نہیں پہچانتے ہیں تمہاری صنوبر ہوں۔ میں تمہارا پیار رہی ہوں۔"

"اب پہچان لیا۔" اس نے صنوبر سے کہا۔

"کیا تم نے کبھی یہ پہچانا کہ پیار کیا ہے۔ کیا تمہیں یقین بھی ہوا کہ پیار بھی کوئی جذبہ ہے۔ تم سب کچھ اپنے مطلب اور غرض کیلئے کرتی ہو۔ تم میں نہ کبھی پیار کا جذبہ پیدا ہوا، نہ ہوگا۔" صنوبر نے اعتراض کیا۔

"تم مجھ پر تہمت لگانے کی کوشش کرتے ہو۔"

"تہمت اس وقت لگائی جا سکتی ہے۔ جب حالات پر یقین نہ ہو۔"

"کیا دیکھا تم نے؟"

صنوبر چیخ پڑی۔ لیکن اصغر نے پرسکون آواز میں کہا۔

"میری آنکھوں میں دھول جھونک کر تھیلدار کے بیٹے کیسا تھ

تم کہاں گئیں تھیں۔
صنوبر نے غصیلی آواز میں کہا۔
"تم نے مجھ پر ایک احسان کیا تو کیا ہوا اور اس کے عوض میں میرا سب کچھ خرید لیا۔ بستر یہ پھول ہے تمہاری۔ میں تمہاری زر خرید لونڈی نہیں ہوں۔ میرے دل میں جو آئے گا وہی کروں گی۔"
"دفع ہو جاؤ میری زندگی سے۔"
ایک بھرپور تھپیڑ صنوبر کے گال پر پڑ گیا۔ صنوبر نے چیختے ہوئے کہا۔
"کون۔ تم جیسے کمینے کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ میں تو خود تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔"
اور اس کے ساتھ ہی وہ چلی گئی۔ چند لمحوں میں وہ عمارت چکنا چور ہو کے رہ گئی۔ جس کو اصغر نے بہت مدت سے تعمیر کیا تھا۔
وہ اپنے آپ کو بجھا ہوا محسوس کرتا تھا۔ خالی بوتل کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے وہ اپنے پرانے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوا۔
ہوٹل کے بار روم میں جوان قہقہے محفل کو رنگین بنا رہے تھے۔ پیمانے سے پیمانے ٹکرا کر ایک نئی زندگی پیدا کر دیتے تھے۔
اصغر کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو تشنہ محسوس کیا۔ عورت کے اس خمار سے بہتر ہے شراب کا خمار، چند لمحے ساتھ تو دیتا ہے۔ اس نے شراب کی بوتل کو گلے لگایا۔ اور بے تحاشہ پینے لگا۔

اور کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ لیکن شراب کا یہ دور ختم ہوتا ہی مبنوں نہ کھانی دیتا تھا۔ اس کے اعصاب ٹوٹے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو لڑکھڑاتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

شراب کی یہ تلخی بھی صنوبر کو بھلا نہ سکی صنوبر کا تصور اس کے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ لیکن زندگی تیزی کے ساتھ کھاگ رہی تھی۔

وہ اپنے پرانے ٹھکانے کے صحن میں داخل ہوا۔ نصرت صحن میں کھڑی تھی۔ وہ آج صحت مند تھی۔

اصغر کے شعور میں ایک بھولی بسری یاد چلی گئی اور اس یاد نے نصرت کو صنوبر میں تبدیل کیا۔

"کیا صنوبر واپس آگئی ؟"

اس کے دماغ نے سوال کیا۔ "کتنی خوبصورت ہو گئی ہے۔ جوانی کے نکھار نے اس پر ہی دم توڑا ہے۔ میں نے اس پہ اپنا سب کچھ فدا کیا اور اس کے بدلے مجھے کیا ملا ؟ آج ... آج تو میرے سامنے سب کچھ ہے۔ ہاں سب کچھ ہے"

وہ آگے بڑھا۔ اس نے نصرت کو اپنی باہوں میں بھینچ لینے کی کوشش کی۔ نصرت چیخ پڑی۔

"ایسے کوئی ہنچے بچاؤ اس شرابی سے"

مولانا بخش نے اپنی بیوی کی چیخ جب سن لی۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے
ن سے باہر آیا۔ اپنی بیوی پر جب اصغر کو حملہ آور پایا۔ وہ چیخ پڑا۔
"کمینے تیری یہ جرأت کہ تو میری بیوی پر بری نظر رکھے۔ میں تیرے سر کا
س بنا دوں گا۔" اس پر مولانا بخش نے اپنا گول ڈنڈا استعمال کیا۔
غر کی خوب مار پٹائی کی اور نصرت کہہ رہی تھی۔
"اس کی اپنی ماں بہن نہیں ہوگی۔ جو دوسروں پر بری نظر رکھتا ہے۔
اب پی کر ہر روز اس کے حواس کبھی بھی بجا نہیں ہوتے ہیں۔"
وہ بری طرح زخمی ہوا تھا۔ مولانا بخش نے اس کو اپنے صحن سے
ال کے سڑک پر پھینک دیا۔
بارش کے قطرے گرنے لگے۔ اصغر کے بدن سے خون کے قطرے
ش کے قطروں سے مل کر خون اور محبت کی نئی داستان لکھ رہے تھے۔
جب بارش سے اس نے اپنے آپ کو پوری طرح نہا لیا۔ تب اس
ے اعصاب میں کچھ قوت پیدا ہوگئی۔ تب اس کو یاد آیا۔ تھوڑی دیر پہلے
س کی عزت کی ناؤ بھی ڈوب گئی۔ مولانا بخش کے گول ڈنڈے نے اس کی خوب
مت کی۔ اس کے زخموں پر پانی گر گیا اور وہ درد سے چیخ پڑا۔
اس نے اپنے آپ میں ساری قوت سمیٹ لی اور وہ نزدیک کے ہسپتال
یں بڑی مشکل کے بعد پہنچ گیا۔ ہسپتال کے اندر داخل ہو کر اس کی قوت
نے جواب دیا اور وہ دروازے پر چکرا کے ڈھیر ہو گیا۔
چپراسی نے وارڈ کے دوسرے آدمی کے سہارے اس کو اندر لایا۔

پر مرہم پٹی کی۔ پھر ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔ وہ دوسرے ڈاکٹر سے کہنے لگا۔

"ٹی۔بی کا اثر اس پر شروع ہوا ہے۔ ابھی پہلا اسٹیج ہے۔ اگر احتیاط نہیں کی تو . . . "

وہ خاموش ہوا اور اصغر پر بے ہوشی طاری تھی۔

نواں باب

صنوبر خوش تھی۔ یہ خوشی اس لئے تھی کیونکہ آسانی کے ساتھ اُس
نے اصغر سے چھٹکارا حاصل کیا۔ وہ تحصیلدار کے بیٹے کے پاس جائے گی اور
اُس سے شادی کر کے ایک چھوٹی سی ریاست کی مالکن بن جائے گی۔
پھر بھی دل کے ایک گوشے سے آواز آتی تھی کہ اصغر تم سے پیار کرتا
ہے۔ وہ اصغر کو بھول جانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اُس کے خیال میں خود ہی
آتا تھا وہ اپنے خیالات کو موڑ نہ سکی۔ وہ یہ جذبہ کچل نہ سکی اصغر کا خیال
اُس کلیجہ کرتا رہا۔

تحصیلدار کے بیٹے نے جب رات کے ایک بجے صنوبر کو اپنے دروازہ
پر پایا۔ تو اُس نے حیران ہو کر کہا۔
"رات کے اس وقت . . . خیریت تو ہے؟"
"میں نے آپ کی محبت پر نظر ثانی کی۔" اُس نے سنجیدہ آواز میں
کہا۔ "اور زمانہ میں تو لالچ نے آپ کا ساتھ دیا۔"
"او میں خوش نصیب ثابت ہوا۔ خیر جان من تم نے میرا ساتھ دیا۔ میں تم
کو اپنی ملکہ بناؤں گا۔ کیا کہنا تو اُن ہاں گر ایک بہت بڑی اسٹیٹ کی" صنوبر

نے مسرت بھری آواز میں کہا۔

"یقین نہیں آتا ہے۔"

"جان من میرا یقین کرو۔ آؤ اندر آؤ۔"

صنوبر اندر آگئی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ شربت کا پیالہ پیش کرتے ہوئے تحصیلدار کے بیٹے نے کہا۔ "آخر تم نے اپنی عقل کا استعمال کیا۔"

وہ اس کے قریب ہو جاتا ہے اور اس کے بالوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"یہ تمہارے سنہری بال کندن کی طرح چمکتے ہیں اور تمہارے ہونٹ گلاب کی پتیاں ہیں۔" اپنے ہونٹوں کو اس کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ صنوبر نے کہا۔

"لیکن۔"

اس نے کہا۔ "میں تمہارا ہوں۔ تم میری ہو۔ پھر یہ فاصلہ۔۔۔" پھر اس نے اپنے لبوں کو صنوبر کے لبوں سے ملا کر کہا۔

"آج کی یہ رنگین رات اور زندگیاں جوان ہیں۔ ہم تم ایک پھر دوسرے کے کیوں ہیں؟" تحصیلدار کے بیٹے نے اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ صنوبر کسمساتی ہے۔ تحصیلدار کا بیٹا کہتا ہے۔ "تم میری ملکہ ہو۔ میں تمہارا راجہ ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے میں کیوں نہ گھل جائیں۔ پھر یہ دوری اچھی نہیں۔۔۔"

"لیکن۔۔۔ یہ ابھی تو۔۔۔"

"سب رشتے کچے ہیں۔ دل کا رشتہ سب سے مضبوط رشتہ ہے۔"

صنوبر کا اعتراض اس کے گرم جذبات کے سامنے دم توڑ گیا۔ وہ بہ [illegible] سب کچھ بھلا بیٹھی۔

دوسری شام تحصیلدار کا بیٹا ملا۔ اس کے ہونٹوں کو چومتے ہوئے کہا۔
"کہو پیاری کیسی ہو"
وہ طنز کے ساتھ کہتی ہے۔" آپ کی دعا سے اچھی ہوں"۔
"اچھا دیکھو اب غصہ تھوک دو کپڑے تبدیل کر لو۔ پرسوں ہماری شادی ہو رہی ہے۔ میں تم کو ایک بہت بڑی دعوت میں اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ وہاں میرے دوست ہوں گے میں ان سے تم کو ملانا چاہتا ہوں"۔
شادی کا نام سن کر اس کا چہرہ کھل اٹھا اور ریاست کا تصور اس کے سامنے گھومنے لگا۔ صنوبر نے اپنے کپڑے تبدیل کئے۔ بالوں کو سنوارا۔ ایسا لگتا تھا کہ حسن کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی ہے۔
وہ پارٹی تھی شاندار جوان مردوں کی اس پارٹی میں صنوبر کے علاوہ اور کوئی عورت نہیں تھی۔ دس آدمیوں کی اس پارٹی میں ہر فرد کے ساتھ اس کو ملایا گیا۔ وہ سب معزز شہری تھے اور ملک کے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔
مینا کو لایا گیا۔ سب ہی پینے لگے لیکن صنوبر نے انکار کیا۔ تحصیلدار کے بیٹے نے کہا۔
"جان من یہ اعلے سماج ہے۔ یہاں جو شراب پینے سے انکار کرتا ہے۔ اس کو گنوار اور بیہودہ سمجھا جاتا ہے۔ اس عظیم محفل میں شوق کیلئے چند گھونٹ پی لو"۔
صنوبر نے پھر انکار کیا۔ لیکن تحصیلدار کے بیٹے نے ضد کی اور اس کی ضد کے سامنے تو اس کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔
لیکن شراب کی چند چسکیوں سے اس کے ذہن پر غشی طاری ہوئی۔

تحصیلدار کے بیٹے نے اپنے معزز مہمانوں سے کہا۔
"ہاں حاضر ہے جناب! لیکن دھن ابھی تک حاضر نہیں ہوا۔"
معزز شہریوں نے اس کے سامنے روپیوں کے ڈھیر رکھ دیئے۔ ایک معزز شہری دوسرے سب سے کہتا ہے۔
"پہلے میں جاؤں گا۔ میں نے تین ہزار دیئے ہیں"۔
تیسرا کہتا "جناب آپ سب چپ رہیں۔ پہلے میں جاتا ہوں۔ میں نے چار ہزار دیئے ہیں"۔
اس کشمکش میں وہ سب صنوبر پر حملہ آور ہوتے ہیں اور تحصیلدار کا بیٹا روپے گننے میں مصروف تھا۔
جب صنوبر نے آنکھ کھولی اپنے آپ کو ایک بوسیدہ پلنگ پر پایا اس کے جسم کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ اس کو محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ایک شیطانی کھیل کھیلا گیا۔ تب اس کے جی نے چاہا کہ وہ تحصیلدار کے بیٹے کا منہ نوچ لے لیکن اس نے دھوکہ کھایا تھا۔ وہ شہر سے دور ایک معمولی ہوٹل میں چھوڑی گئی تھی۔
اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اب وہ کمرے سے باہر جانے کیلئے تیار ہوئی۔ لیکن اس نے کمرے کا دروازہ بند پایا۔
تب ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ مولا بخش تھا۔ مولا بخش نے اپنا گول ڈنڈا ہوا میں لہرایا اور صنوبر سے کہا۔
"تم کو میں نے خرید لیا ہے اب تم کو میرے لئے کام کرنا ہوگا"۔

"کیا مطلب؟"

صنوبر نے سوال کیا مولا بخش نے اپنی مونچھوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"چکلہ چلاتا ہوگا"

"کیونکہ"

"یہ تیج بیتی ہے۔ مولا بخش کا یہ روپ دیکھنے کے لئے آدمی قطعی تیار نہیں تھا لیکن حقیقت کے سامنے کون انکار کر سکتا ہے۔ مولا بخش کی گھناؤنی زندگی سب لوگوں سے چھپی ہوئی تھی لیکن اصل میں وہ تھا کیا؟ ایک کمینہ اور شیطان !!!"

دسواں باب

اصغر نے جب ہوش سنبھالا۔ تب اس نے اپنے آپ کو ہسپتال کے صاف ستھرے بستر پر پایا۔ سارے جسم پہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں... کیسے آیا... کب آیا... اس کو کچھ بھی یاد نہ تھا۔ دھیرے دھیرے سارا واقعہ اس کے سامنے آگیا۔ وہ چیخ پڑا۔

"مولا بخش نے مجھے مارا"

نرس جلدی سے اس کی طرف دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے کہا:

"آرام کیجئے"۔

لیکن وہ آرام کیا کرے گا۔ شہر کی اس رنگین دنیا نے اس کا سب کچھ لوٹا تھا۔ اس کے پاس جو سکون بھرا دل تھا۔ اس میں انتشار پیدا کیا گیا۔ تب اس کو اپنا گاؤں یاد آیا۔ وہاں کی صاف و شفاف ندی یاد آتی ہے۔ وہاں کے قطار در قطار درخت یاد آتے ہیں۔ دور گاؤں کا چھوٹا کلیسا یاد آیا۔ اس کو پر سکون دن یاد آتے ہیں۔ وہ سکون کا متلاشی تھا۔

گذر گئے تھے بھی وقت ماضی میں کیسے لمحے سکون دل کے
سکون دل بھی رہا نہ باقی یہ دل بھی دور ہوتا جا رہا ہے
وحشی سید ساحل

ڈاکٹر صاحب اُس کے پاس آیا۔ ڈاکٹر نے اُس کا معائنہ کیا معائنہ ختم کر کے ڈاکٹر نے کہا۔

"مسٹر تم کو اپنی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ ورنہ تم اپنے آپ کو بگاڑ کے رکھو گے"

"بگاڑ کے؟"

بگاڑ کے تو کب کا اُس نے اپنی صحت کو رکھا تھا۔ زندگی سے اس کو نفرت ہو گئی ہے وہ اب اس زندگی سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔

ہسپتال کی دواؤں اور آرام کی بدولت اُس کے زخم بھر گئے۔ لیکن دل کا زخم ہر دن بڑھتا ہی گیا۔ ڈاکٹر نے اصغر سے کہا۔

"اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ لیکن احتیاط کی ضرورت ہے فی الحال آپ کو ہسپتال میں رہنا پڑے گا۔ ہاں ہر روز صبح کو ساحل کی سیر کرنا۔ اس طرح کی ہوا خوری تمہاری صحت کے لئے اچھی ہے۔"

اچھا کیا ہے؟ بُرا کیا ہے؟ اصغر اب تک یہ سمجھ نہ پایا تھا۔ اب تک اس کی زندگی بھول بھلیوں میں کٹ گئی تھی۔

وہ اپنے کندھے پر شاہ توس کی چادر ڈال کے ساحل کی سیر کرنے کے لئے نکلا۔ ساحل پر چھوٹے چھوٹے بچے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اُن کا معصوم کھیل دیکھ کر اس کو گاؤں یاد آیا۔ سمندر کی موجیں جھوم جھوم کر ساحل کو چوم رہی تھیں۔ وہ ایک بڑی چٹان پہ بیٹھ کر ان موجوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

زندگی بھی ایک موج ہے۔ جو عروج پر جا کر گرتی ہے اور ملیا میٹ

سو جاتی ہے۔

ایک قدم اٹھاتے ہی اس کے کاندھے پر پڑا۔ ایک سریلی آواز اس کے کانوں میں آ گئی۔

"بابوجی! صرف بیس روپے اور چوبیس گھنٹے ... پوری رات ... اور چوبیس گھنٹے۔"

اصغر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن سامنے صنوبر کو پایا۔ اسے تمنا نہ تھی۔ اُسے قطعی امید نہ تھی۔ لیکن وہ اچانک اور اس لباس میں صنوبر سامنے آئے گی اس کے لئے تیار نہ تھا۔

صنوبر نے جب اس کی طرف دیکھا تو وہ بھاگنے لگی۔ لیکن اصغر نے اس کا بازو پکڑا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"وہ خود [illegible]!"

"کیا بات ہے؟" اصغر نے کہا۔ "تم اتنی گھبرائی سی کیوں ہو؟ یہ مولانا بخش کون ہے؟"

"تم نہیں سمجھتے ہو۔ میں بک چکی ہوں۔ میں طوائف ہوں۔ مولا بخش نے مجھے خریدا ہے۔" وہ رونے لگی۔ صنوبر کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل پگھل گیا۔ نہ جانے صنوبر کو دیکھ کر وہ کیوں ہر بار اپنا وقار بھول جاتا ہے۔ یہ سچ ہے محبت کی دنیا میں آدمی اندھا بن جاتا ہے۔ اصغر نے کہا۔

"لیکن اب تم میرے ساتھ چلو گی؟"

"کیسے چل سکتی ہوں۔ مولا بخش سائے کی طرح میرا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ

خوفناک غنڈا ہے۔ وہ تم کو مار ڈالے گا۔"

"کس کی طاقت ہے جو تم کو میرے ہاتھ سے چھین لے، کون ہے جو میرے راستے میں کھڑا ہو جائے گا؟"

وہ جذبات کی رو میں بہہ کر چیخ اٹھا۔ لیکن صنوبر نے کہا۔

"مولا بخش ہماری طرف آ رہا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

صنوبر نے اشارے سے دکھایا۔ مولا بخش اپنا چھوٹا گول ڈنڈا ہاتھ میں نچاتا ہوا خراماں چلا آ رہا تھا۔

"تو یہ ہے وہ آدمی۔"

اصغر کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ مولا بخش سامنے پہنچ گیا۔ مولا بخش نے کہا۔

"اصغر لڑکی میرے حوالے کرو۔"

"شرافت کے پجاری یہ ہے تیرا اصلی روپ۔ اگر تجھ میں غیرت ہے تو ... دفع ہو جا۔ یہ لڑکی اب میرے ساتھ جائے گی۔" اصغر نے چیخ کر کہا۔ آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ مولا بخش نے کہا۔

"بچے تم سے بیر رکھتا ہے اس لڑکی کے لئے۔ اس کو میں نے خریدا ہے اور یہ میرے ساتھ جائے گی۔"

اس نے صنوبر پر ہاتھ رکھا۔ اصغر نے اسکا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

"پول کھول دوں گا تمہاری اگر اپنی عزت کا خیال ہے تو چلے جاؤ۔"

"تیری یہ ہمت کہ تو مولا بخش کو للکارتا ہے۔ کہہ کونسی بات ایسی ہے۔ جس کی تو مجھے دھمکی دے رہا ہے"۔ مولا بخش کا لمبا چاقو اس کے سر پر پہنچ گیا"۔ ورنہ تیرا خون یہاں ہی بہا دوں گا"۔

"لڑکیوں کا بیوپار کرنے والے مولا بخش تو میرا خون کیا بہا سکتا ہے"؟ اصغر نے بے دھڑک کہا"۔ جو دوسروں کی عزت برباد کرتا پھرتا ہے۔ اس کی اپنی بیوی عزت لٹاتی ہے"۔

مولا بخش نے چیخ کر کہا"۔ تہمت لگاتا ہے میری پارسا بیوی پر"۔

"تہمت نہیں لگا رہا ہوں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ جا کر اپنی بیوی سے پوچھ۔ تیرے یہاں جو بچہ پیدا ہونے والا ہے وہ تیرا ہے یا میرا"؟

مولا بخش کے ہاتھ ڈھیلے پڑے۔

"کمینے تو نے میرے گھر کو لوٹا، اگر یہ جھوٹ ثابت ہوا تو تجھے قتل کر دوں گا یاد رکھنا"۔

اس کے ساتھ ہی مولا بخش تیزی کے ساتھ گھر کی طرف چلنے لگا۔

"کمینہ . . . . ہاں میں کمینہ ہوں"۔

اصغر بڑبڑایا"۔ ہر ایک نے میرے خون کا نیلام کیا۔ پھر بھی میں کمینہ ہوں"۔ پھر منور سے کہا"۔ چلو میرے ساتھ"۔

غصے کی بھٹی میں جلا ہوا مولا بخش جب اپنے گھر میں داخل ہوا۔ چیخ کر اپنی بیوی کو بلایا۔

"نصرت"۔

نصرت نے جب مولا بخش کی لمبی مونچھوں کو پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھا۔ تو وہ سہم گئی۔

"آپ . . . اس وقت کیا بات ہے؟"

"ہاں"

وہ چیخ پڑا۔ اس کا لمبا چاقو نصرت کے گلے کے قریب پہنچ گیا۔ نصرت کے اعصاب پھٹنے لگے۔ پسینے سے سارا جسم شرابور ہو گیا۔ مولا بخش نے کہا۔

"سچ بتا یہ بچہ کس کا ہے۔ اصغر کا ہے یا میرا۔"

نصرت کے اعصاب پر کمزوری طاری ہو گئی۔ وہ جھوٹ نہ بول سکی۔

"اصغر"

مولا بخش کا پانچ انچ چاقو اس کے پیٹ میں اتر گیا۔ بچہ بھی مولا بخش کے لمبے چاقو سے نہ بچ سکا۔

محلے کے لوگ جمع ہوئے۔ پولیس آئی مولا بخش گرفتار ہوا۔ ایسی خبریں آج کل اخباروں میں چھپتی ہی رہتی ہیں۔ دہلی میں ایک آدمی نے چاقو سے اپنی بیوی کو مارا۔ ملٹری کے ایک سپاہی نے اپنی بیوی اور تین بچوں کو اپنی بندوق کا نشانہ بنایا۔ اس لئے مولا بخش کی خبر اخباروں کیلئے کوئی نئی خبر تھی اور نہ ہی سنسنی خیز۔ اب عدالت مولا بخش کو سزائے موت دیگی یا عمر قید۔

گیارہواں باب

صنوبر اور اصغر ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئے اصغر نے کہا۔
"میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ ہم دو کمرے لے سکیں اور میرا اپنا پرانا ٹھکانہ مجھ سے چھین لیا گیا۔ اس لئے..."
"ہاں سمجھی" صنوبر نے کہا "ٹھیک ہے۔ اس میں ہرج کی کونسی بات ہے"
"دیکھو ہم ایسا کرتے ہیں تم اندر والے کمرے میں سو جاؤ اور میں باہر والے کمرے میں سوتا ہوں"
"نہ... "
صنوبر کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکی آج اس کا دل سب جامے توڑ کر کہنا چاہتا تھا کہ اگر اسے کسی سے پیار ہے تو وہ اصغر ہے۔
لیکن اس نے اصغر کو کھویا ہوا محسوس کیا۔ جیسے وہ پیار کی پہلی سی حرارت اس میں ختم ہوتی تھی۔ کیا یہ سب اس نے صنوبر کے ساتھ اخلاقی ذمہ داری کے طور پر کیا تھا۔ کیا اب وہ صنوبر سے پیار نہیں کرتا ہے۔ صنوبر کے دل میں ایسے خیال آتے رہے۔
صنوبر کو محسوس ہوا کہ اصغر نے اپنا حق کھو دیا ہے اب وہ چین

نہیں ہے۔ اب اُس کے سنہرے بال کندن کی طرح نہیں چمکتے تھے۔ اس لئے اصغر کو اُس سے پیار نہ رہا۔

لیکن اصغر اُس سے پیار کرتا تھا۔ دل و جان سے چاہتا تھا لیکن ایسے مرض نے اُس کو گھیر لیا تھا جس کی وجہ سے وہ صنوبر کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کیسے صنوبر کو سمجھائے کہ وہ اب ایک مردہ لاش تھی۔ جو اب چند دنوں تک رخصت ہونے والی ہے۔ وہ صنوبر کو خوش دکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی یہ کوشش ناکام سی نظر آرہی تھی۔

لیکن صنوبر احساس کمتری کا شکار ہو کے رہ گئی تھی۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ اُس نے حسن کھو دیا۔ اسلئے اصغر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے۔

صنوبر نے ایک دن خوب بناؤ سنگھار کیا۔ جسم کے کئی حصوں کو رنگایا لیا۔ اس عارضی رنگ نے اس کو پھر ایک بار حسن کی ملکہ بنا دیا۔

اصغر جب کمرے کے اندر داخل ہوا ہے۔ وہ اُس کے گلے لگ گئی۔ اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ اصغر بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کی باہوں سے آزاد کرتا ہے۔ صنوبر کہتی ہے۔ "اصغر آج مجھ سے پیار کر لو۔ بھول جاؤ سب کچھ اصغر میں پیار کی بھوکی ہوں۔ مجھ سے پیار کر لو۔ خوب پیار کر لو۔"

لیکن اصغر بدستور خاموش رہا ہے۔ وہ اُس کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ ایک بار پھر اُس کو نفسی جنون نے پاگل بنا دیا ہے صنوبر چیخ کر کہتی ہے۔

"تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے ہو۔ میں صنوبر بول رہی ہوں۔

جس سے تم پیار کرتے تھے۔ مجھ سے پیار کرو۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔ تم کو کیا ہوا اصغر؟

اصغر دھیمی سی آواز میں کہتا ہے۔

"آرام کرو۔"

"آرام" وہ چیخ پڑتی ہے۔ "مجھے آرام نہیں چاہیئے۔ مجھے پیار چاہیئے میں پیار کی متلاشی ہوں۔ مجھ سے اصغر پیار کرو۔"

اصغر خاموش رہا۔ تب صنوبر غصے سے پاگل ہو جاتی ہے اور اس نے توڑ پھوڑ کی کاروائی شروع کی۔ آئینہ توڑ ڈالتی ہے اور بستر ادھر ادھر پھینک دیتی ہے۔ لیکن اصغر خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتا ہے۔ صنوبر نے کہا۔

"تم اب بھی کچھ نہ کہو گے"۔ وہ رو پڑتی ہے۔ "اصغر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" پھر وہ بستر پر گر کر سسکیاں لینے لگی۔

لیکن اصغر نے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ خاموش رہا اور اپنے کمرے میں بستر پر خاموش پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس پر نیند کا غلبہ ہوا۔ جب وہ بیدار ہوا۔ اس وقت سورج نکل رہا تھا۔ اس نے اپنی تولیہ سنبھالی اور اپنے کمرے سے باہر آیا۔

اس نے صنوبر کا بستر خالی پایا۔ سمجھا کہ وہ غسلخانے میں ہو گی۔ اس نے ... لیکن غسلخانہ خالی پڑا تھا۔ پھر دیکھا کہ اس نے اپنے سب کپڑے ... لئے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس نے اپنا سر پکڑ لیا

ہوا محسوس کیا۔ اُس کی کمر ٹوٹ گئی۔ سوچا تھا زندگی کے باقی دنوں میں
صنوبر ساتھ دے گی۔ اور یہ چند دن وہ اس کے سہارے کاٹ لیگا۔
لیکن صنوبر پھر اس کو چھوڑ کر چلی گئی۔

سارے شہر کو چھان مارا۔ لیکن صنوبر کہیں نہ ملی۔ اب وہ شہر کے
آخری حصے میں جا رہا تھا۔ سماج کے معمار اس کو طوائف بازار کہتے ہیں
جہاں جسم کو فروخت کیا جاتا ہے۔

مطلع صاف نہیں تھا۔ دن بھر شدت کی گرمی تھی۔ وہ کچھ پینا
چاہتا تھا۔ وہ کچھ پینے کے لئے تشنہ تھا۔ تب ایک طوائف کے مکان
سے آواز باہر آتی ہے۔

پھر وہ نہ آئیں گے پلٹ کر انہیں لاکھ غم ستائیے

اُس مکان کی طرف اُس کے قدم خود بخود چل پڑے وہ یہاں
داخل ہوا۔ جوانی بل کھاتی ہوئی ناچ رہی تھی۔ اور سرخ بوتل پروانوں
کے بیچ میں، ان بیوقوفوں پر قہقہے لگا رہی تھی۔

"یہ سرخ بوتل"

اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پیاس کچھ بڑھتی
ہی گئی۔ تشنگی کچھ کم نہیں ہوئی۔ اُس نے جھپٹ کر بوتل کو گلے لگایا۔
اور بے تحاشہ پینے لگا اور خود سے اپنے حواس کھوئے۔ لیکن پھر
بھی ایک آواز اُس کے کانوں تک آتی تھی۔

پھر وہ نہ آئیں گے پلٹ کر انہیں لاکھ غم ستائیے۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے طوائف کے گھر سے باہر آیا۔ بارش زور زور سے گرنے لگی۔ اس نے اپنے گرم گرم کوہ رد پانی سے نہالیا۔ اچانک اس کو محسوس ہوا کہ قے اس پر اثر کر رہا ہے اور جیسے قے ہوئی تو وہ بار بار اس قے کو دیکھتا رہا۔ سُرخ سُرخ خون، ہاں سُرخ خون تھا۔ خون اور محبت ہر بار اس کا پیچھا کرتے رہے۔ وہ مسکرا پڑا اور قہقہہ لگانا چاہتا تھا۔ لیکن اب اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ قہقہہ لگا سکے یا بات کر سکے۔ وہ بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔ اس پاس کے لوگ جمع ہوئے۔ کچھ لوگوں نے اس کی نبض دیکھی۔ جب دیکھا کہ ابھی کچھ دم باقی ہے۔ تو اس کو مقامی ہسپتال میں داخل کیا۔

جب ڈاکٹر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

"تو یہ وہی مریض ہے جو چند دن پہلے ہسپتال سے غائب ہوا تھا"

ڈاکٹر نے اصغر کا معائنہ کیا اور اپنے دوسرے ساتھی سے کہا۔

"اب اس کی حالت مایوس کن مقام پر پہنچ گئی ہے"

نرس نے انجکشن لگایا۔ دوسرے دن وہ اپنے ہوش و حواس میں آیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔

"مسٹر بسمل نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ آپ اپنی ہمت کا

خاص خیال رکھنا۔ ورنہ مرض نہایت خطرناک ہو جائے گا۔ لیکن آپ نے لاپرواہی برتی اور اپنے آپ کو بگاڑ کے رکھا۔ اب بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ آپ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھیں۔ ورنہ نتیجہ کچھ اچھا نہ ہوگا۔"

"ڈاکٹر صاحب! اب میری زندگی بجھتے ہوئے چراغ کی مانند ہے۔"

اصغر نے نہایت مایوس کن لہجہ میں کہا۔

"اب یہ چراغ میری لاکھ طرح احتیاط کرنے سے بجھنے سے نہیں رہ سکتا ہے۔"

ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اصغر زندگی سے تنگ آ کر مایوس ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انشاء اللہ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔"

"تپ دق کا مریض۔"

وہ بڑبڑا رہا تھا۔ زندگی اس سے دور بھاگ رہی تھی۔ اور لوگ اس کو جھوٹی تسلیاں دے کر اس کا جی بہلا رہے ہیں وہ اس سرخ خون کی قے کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اب زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتا پھر یہ لوگ کیوں اسے زندہ رہنے کی امید دلا رہے ہیں۔

بارہواں باب

صنوبر نے ایک دربہ آواز دی، ایک بوڑھی عورت باہر آئی۔ بوڑھی عورت نے ترش آواز میں کہا۔

"کہو کیا چاہیئے"؟

"اماں جی" صنوبر نے کہا۔ "اگر آپ کے پاس کوئی کام ہے میں کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے صرف دو وقت کی روٹی چاہیئے"

بوڑھی نے ترش آواز میں جواب دیا۔

"نہیں ہے۔ آگے بڑھو"

"اماں جی میں کوئی بھی کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ کوئی بھی معمولی سے معمولی کام کرنے کے لئے تیار ہوں"۔

"ارے بابا کہا نا کوئی کام نہیں ہے۔ چلو چلتی بنو"۔ بوڑھی نے غصہ بھری آواز میں کہا۔ "آجاتی ہیں جلنے کہاں سے ایری غیری... نہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام لگتی ہیں الٹے جوتے نے۔ ایسی عورتوں نے نہ جانے کتنے گھروں کو برباد کیا ہے"۔

اور بوڑھی نے اس کے ساتھ ہی دروازہ بند کر لیا۔ صنوبر

ن دل سے بھوکی تھی - اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ اصغر کے
اس واپس گئی۔ لیکن ہوٹل سے معلوم ہوا کہ وہ کہیں چلا گیا ہے۔
پہن نے اصغر کو وہ اپنا سب کچھ سمجھتی تھی۔ لیکن کچھ شکوک
پیدا ہوئے۔ اب ان شکوک کی وجہ سے اس کا ذہن بیمار
بنتا تھا۔

صنوبر کے بھوک کے پیٹ نے اسکو مجبور کیا کہ وہ دوسرے
در پر کو دستک دے۔ ایک نوجوان آدمی باہر آیا۔ صنوبر نے کہا۔
"بابو صاحب آپ کے پاس کوئی کام ہوگا۔ میں سب کام کرنے
کے لئے تیار ہوں۔ بابو صاحب کچھ الطاف کیجئے۔ میں تین دن سے
بھوکی ہوں"۔

نوجوان نے اس پر اوپر سے نیچے تک نظر ڈالی۔ پھر خود ہی
بڑبڑایا۔ "چل جائے گی"۔ پھر اس نے صنوبر سے کہا۔
"چلو اندر چلو"۔

صنوبر کو باورچی خانے میں لایا۔ سب کھانے اس کے سامنے
رکھے۔ بابو نے کہا۔
"کھالو"۔

وہ بھوکی شیرنی کی طرح کھانے پر جھپٹ پڑی۔ کھانا کھانے
کے بعد بابوجی نے کہا۔
"تمہارے یہ سنہرے بال کندن کی طرح چمک رہے ہیں"۔

صنوبر کو بھولی بسری باتیں یاد آگئیں۔ تب اُس کو یاد آیا کہ کوئی اُس کے ہونٹوں کو چوم رہا تھا۔ یہ بالو جی ہی تھا۔ صنوبر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بالو جی یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"میں نے تمہارے بھوکے پیٹ کی بھوک مٹائی"۔ بالو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن میں تو بھوکا ہوں"۔

پھر اُس نے صنوبر کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بالو نے صنوبر کے ہاتھ میں پانچ روپے رکھے۔ باہر کا راستہ دکھایا۔ صنوبر کو شدید غصہ آیا اور اس کے دل نے چاہا کہ نوٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ سوچا چلو پانچ دن تو گذر جائیں گے۔

لیکن پانچ دن کے بعد پھر وہی بھوکا پیٹ اُس کے سامنے تھا۔ ننگے جسم اور بھوکے پیٹ کے لئے اُس کو کچھ علاج تو کرنا تھا۔

جسم کو فروخت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ جسم کو فروخت کرتی رہی۔ لیکن جسم ہر دن کے بعد اپنی طاقت کھوتا رہا۔

اب اس کی ایک دم توڑتی ہوئی آتما تھی۔ اب اس کا

بنا ؤ سنگار بھی پرانے حسن کو واپس نہیں لا سکتا تھا۔
اس کو ایک ایسے مرض نے گھیر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ جسم بھی فروخت نہ کر سکتی تھی۔ نہ اب اس کو کوئی خریدنے کے لئے تیار تھا۔
وہ اب سڑک پر بھیک مانگتی تھی۔ کارل مارکس کا فلسفہ پڑھنے والی لڑکی کا حلیہ ہی زندگی نے بدل کر رکھ دیا۔
حسن کی اس ملکہ کو جب کوئی انسان دیکھتا تو نفرت سے منہ موڑ لیتا۔
صنوبر زندگی کا یہ پہلو دیکھنے کے لئے کبھی تیار نہ تھی۔ ریاست کی مالکن بننے والی اس لڑکی کو بھکارن بننا پڑا۔ یہ بات کبھی اس کے تصور میں بھی نہ آئی ہو گی۔
تب اس کو احساس ہوا کہ اگر دنیا میں رہنا ہے تو ایک رشتہ چاہیئے اور وہ رشتہ مضبوط رشتہ ہونا چاہیئے اور وہ ہے پیار کا رشتہ۔ محبت کے اس رشتے کے سامنے دولت کچھ بھی نہیں۔ لیکن یہ احساس اس کے اندر تب پیدا ہوا۔ جبکہ سورج غروب ہونے والا تھا۔ جب اس کی اپنی زندگی اختتام پر آنے والی تھی۔
سڑک کو پار کرتے ہوئے صنوبر نے محسوس کیا کہ آسمان ٹوٹ گیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو چکراتا ہوا محسوس کیا اور وہ

سڑک پر گر پڑی۔

ایک گاڑی تھی جس کی صنوبر کے ساتھ ٹکر ہوئی تھی۔ آس پاس کے لوگ جمع ہوئے۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔

"ارے جلدی کرو۔ اس کو ہسپتال لے چلو"

بے ہوشی کے اس عالم میں ایک ہی نام صنوبر کے لب پر بار بار آتا تھا۔ وہ تھا اصغر کا نام۔ صنوبر کے دماغ کے ہر حصے پہ اصغر کا چھاپ لگی تھی۔

ایمرجنسی وارڈ کے سب ڈاکٹر صنوبر کا معائنہ کرنے لگے۔ صنوبر شدید زخمی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کا ہر حصہ پٹیوں سے بندھا تھا۔ ڈاکٹر ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے

"شاید قسم کا حادثہ ہوا ہے۔ سینے کی ہڈیاں چکنا چور ہو کے رہ گئی ہیں۔ خون کی بھی کمی ہے۔ محال ہے اس کا بچنا"

سارے ہسپتال میں اس حادثے کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ مریض لوگ اس عورت کو از راہ ہمدردی دیکھنے آتے تھے۔ اصغر نے اپنی نرس سے معلوم کیا۔

"کیا بات ہے نرس؟ سارے ہسپتال میں یہ انتشار کیوں پھیلا ہوا ہے؟"

"شاید کسی عورت کا گاڑی کے ساتھ حادثہ ہوا ہے۔ بچ نہیں

سکتی ہے"

"او۔ کیا میں بھی اس کو دیکھنے کے لئے جا سکتا ہوں؟" اُس نے نرس سے معلوم کیا۔ نرس نے کہا:

ہاں کیوں نہیں جا سکتے ہو؟"

وہ اپنے کمزور بدن کے سہارے صنوبر کے بستر کے قریب پہونچ گیا۔ اُس نے مریضہ کو پٹیوں سے لپٹا ہوا پایا۔ اصغر بڑبڑایا۔

"آف اس قدر شدید حادثہ"

اس وقت ایک انجانی سی طاقت صنوبر کے اندر آگئی اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

اصغر سب کچھ بھول سکتا تھا۔ لیکن اِن آنکھوں کو نہیں بھول سکتا تھا۔ جب وہ پہلے دن کالج آیا۔ اُس دن بھی انہی آنکھوں نے اس کو متاثر کیا تھا اور آج وہی آنکھیں اس حالت میں؟ اس کو یقین نہیں آتا تھا۔ وہ چیخ پڑا "صنوبر"۔

"ا... ا... صغر" صنوبر میں اب بولنے کی قوت بھی نہیں تھی۔ اُس نے اپنے آپ میں ساری قوت سمیٹ لی" موت اب قریب ہے اصغر۔ وہ دیکھو وہ چلی آرہی ہے"

"نہیں میری جان تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی ہو"

اصغر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"تم اچھی ہو جاؤ گی۔ پھر ہم اس شہر کی دوزخ کو چھوڑ کر گاؤں چلے جائیں گے۔ تم میرے گاؤں چلو گی نا! میرا ایک چھوٹا گھاس کا جھونپڑا ہے۔ میرے لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں۔ ہم اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کریں گے۔"

"پیارے" صنوبر نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نہیں جانتے ہو مجھے تم سے کتنا پیار ہے۔ یہ احساس مجھے تب ہوا۔ جب زمانے نے کاری ضرب مجھ پر لگا دی۔ کاش یہ ہوش مجھے ہوش کھونے سے پہلے آتا۔ پیار کو بے معنی سمجھا اور خود زندگی کھو بیٹھی۔ جانِ صنوبر اب موت میں چلے جانے سے پہلے ان خشک ہونٹوں کو چوم لو۔ جو تمہارے آخری بوسے کا انتظار کرتے ہیں۔"

"نہ میری جان ایسا مت کہو"۔ اصغر نے صنوبر کے ہونٹ کا چومتے ہوئے کہا۔ "تم زندہ رہو گی تو میں زندہ رہوں گا۔"

لیکن صنوبر کی کھلی آنکھوں میں زندگی کی چمک ختم ہوئی تھی۔ وہ ایک مردہ لاش سے باتیں کرتا تھا۔ اچانک اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل پڑی۔

سارا ہسپتال اس چیخ سے جاگ پڑا۔ لیکن اب صنوبر کی لاش کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔ ہسپتال والوں نے صنوبر کی لاش

کو سپردِ خاک کیا۔
اصغر پاگلوں کی طرح صنوبر کی قبر کو چوم رہا تھا۔ وہ کہتا تھا۔

"جان میری آ و نا! کیسے کٹے گی تمہارے بغیر یہ زندگی"۔
اب اس میں ہر قوت ضائع ہو کے رہ گئی تھی۔ اُس کے لئے زندگی ایک بوجھ بنی ہوئی ہے۔

اس کو سارا جہاں جلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اُس کو شہر کی دنیا ہولناک لگتی تھی۔ ایسا لگتا تھا۔ اس رنگین دُنیا نے اس کا سب چھین لیا اور یہاں رہ کر بار بار اس کو اپنا پیارا گاؤں یاد آ رہا تھا۔ شہر کی رونق سے اُس کا دل بجھ گیا۔ اب وہ اس رنگین دُنیا سے بھاگ کر اپنے معصوم گاؤں واپس جانا چاہتا تھا۔ زندگی کے یہ چند دن وہ اب اپنی جھونپڑی میں کاٹ لینا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اس زندگی کے باقی دن سکون سے کاٹ لے۔ تب اس کو گاؤں کے چھوٹے چھوٹے درخت یاد آ گئے۔ بل کھاتی ہوئی ندی یاد آئی۔ اور وہ چھوٹا کلیسا یاد آیا۔ وہ دوڑتے ہوئے ریلوے سٹیشن پہونچ گیا۔ بابو سے ٹکٹ حاصل کیا۔ وہ بہت جلد گاؤں پہونچنا چاہتا تھا۔ وہ ریل کے ڈبے میں داخل ہونے ہی والا تھا۔ کہ دو شرابیوں نے اُس کو باہر دھکیل دیا۔

اُس نے کہا۔

"حواس بگڑ گئے ہیں تم لوگوں کے"۔

ایک شرابی نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔

"بابو آپ نے زیرکی کہی"۔

پھر وہ دوبارہ ڈبے میں داخل ہوا۔ ریل چل پڑی۔ اچانک اُس کو محسوس ہوا۔ وہ تشنہ ہے۔ اُس کو پیاس لگ رہی تھی۔ اُس کی یہ تشنگی بڑھتی ہی گئی۔ ریل رُک گئی اور اُس کے ساتھ ہی اس کی سیٹ کے نیچے سے ایک سرخ بوتل باہر آئی۔

یہ سرخ بوتل کبھی ادھر جاتی تھی کبھی اُدھر جاتی تھی۔ وہ بوتل کو تک رہا تھا۔ آخر اُس نے بھاگتی ہوئی شراب کی بوتل پر قبضہ کیا اور پھر وہ بے تحاشا پینے لگا۔

اس کے بدن کی قوت چھن گئی۔ ریل رُک گئی۔ باہر سے قلی نے آواز لگائی۔

"بیلا گاؤں"۔

"میرا گاؤں آگیا"۔ وہ چیخ پڑا۔ "مجھے اپنے جھونپڑے تک پہونچنا ہے"۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ریل سے اُترا۔ اچانک اُس کو قے آئی اور یہ قے سرخ خون تھا۔ وہ مسکرا پڑا۔ اور اس نے

کہا۔

"خون اور محبت کی اس داستان کا اختتام ہوا۔"

لیکن اُس کو گھر پہونچنا تھا۔ وہ اپنی گھاس کی جھونپڑی میں مرنا چاہتا تھا۔ لیکن گھر کا فاصلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا اور اس کی ٹانگیں ہر پل کے بعد جواب دے رہی تھیں۔

آخر وہ گھر کے قریب پہونچ گیا۔ لیکن خون کی آخری ہچکی نے اُس میں اتنی قوت نہ رکھی تھی کہ وہ گھر کے اندر داخل ہو۔ موت کے فرشتے نے اُس کو ہمیشہ کے لئے اپنی آغوش میں لے لیا۔"

"ختم شد"

مصنف کی باقی مشہور مطبوعات

۱۔ غریبوں کا دیس
۲۔ الٹا انسان
۳۔ پتھر کے صنم
۴۔ خالی پڑک ہے تانگیں
۵۔ بدلہ
۶۔ قصہ دراصل یہ ہے
۷۔ منزل اور تلاش
۸۔ تم کی رات
۹۔ قحط

صرف پانچ روپے مع ڈاک خرچ کے حاصل کیجئے :۔

پبلشرز نما:۔ پوشش، کرن نگر، سرینگر، کشمیر

وادئ کشمیر کا واحد

ادبی

اور

فلمی

ماہنامہ

نگینہ

سالانہ . . . . دس روپے

(خاص نمبر مفت)

شائع کردہ:-

پوش کرن نگر سرینگر (کشمیر)

آئندہ ناول کی چند جھلکیاں

* ایک داستان جو غیر معمولی نوعیت کی ہے۔
* ایک واقعہ جو آپ کے سماج میں رونما ہوا ہے۔
* ایک حقیقت جو بدنما ہے۔

سڑک جا رہی ہے

حشی سعید ساحل کی یہ دلچسپ جنسی داستان ساڑھے تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ رنگین جلد سے سجائی گئی اس کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ چھ روپے ہے

پوشش نگر سرینگر کشمیر